بابا فریدالدین مسعودؒ

گنجِ شکر رحمۃ اللہ علیہ

جعفر قاسمی

ترجمہ

طاہر اسدی

اسلامک بک فاؤنڈیشن

اسلامِک بُک فاؤنڈیشن

۲۴۹- این- سمن آباد- لاہور

واحد تقسیم کار: "المعارف"، گنج بخش روڈ، لاہور

سلسلۂ مطبوعات نمبر (۳۶)

ناشر ـــــ اسلامک بک فاؤنڈیشن
۲۴۹-این-سمن آباد-لاہور

طابع ـــــ مکتبہ جدید پریس-لاہور

تقسیم کار ـــــ المعارف گنج بخش روڈ لاہور

بشکریہ ـــــ علاقائی ثقافتی ادارہ پاکستان شاخ

سال اشاعت ـــــ ۱۳۹۸ھ ـــــ ۱۹۷۸ء

تعداد ـــــ ایک ہزار

قیمت ـــــ اشاعت عام -/ اشاعت خاص -/

بسعی واہتمام:

الحاج محمد ارشد قریشی القادری

ایم اے (اقتصادیات) ایم اے (علوم اسلامیہ)

اعزازی ڈائریکٹر : اسلامک بک فاؤنڈیشن

۲۴۹-این سمن آباد - لاہور ○ فون ۴۱۵۲۴۷
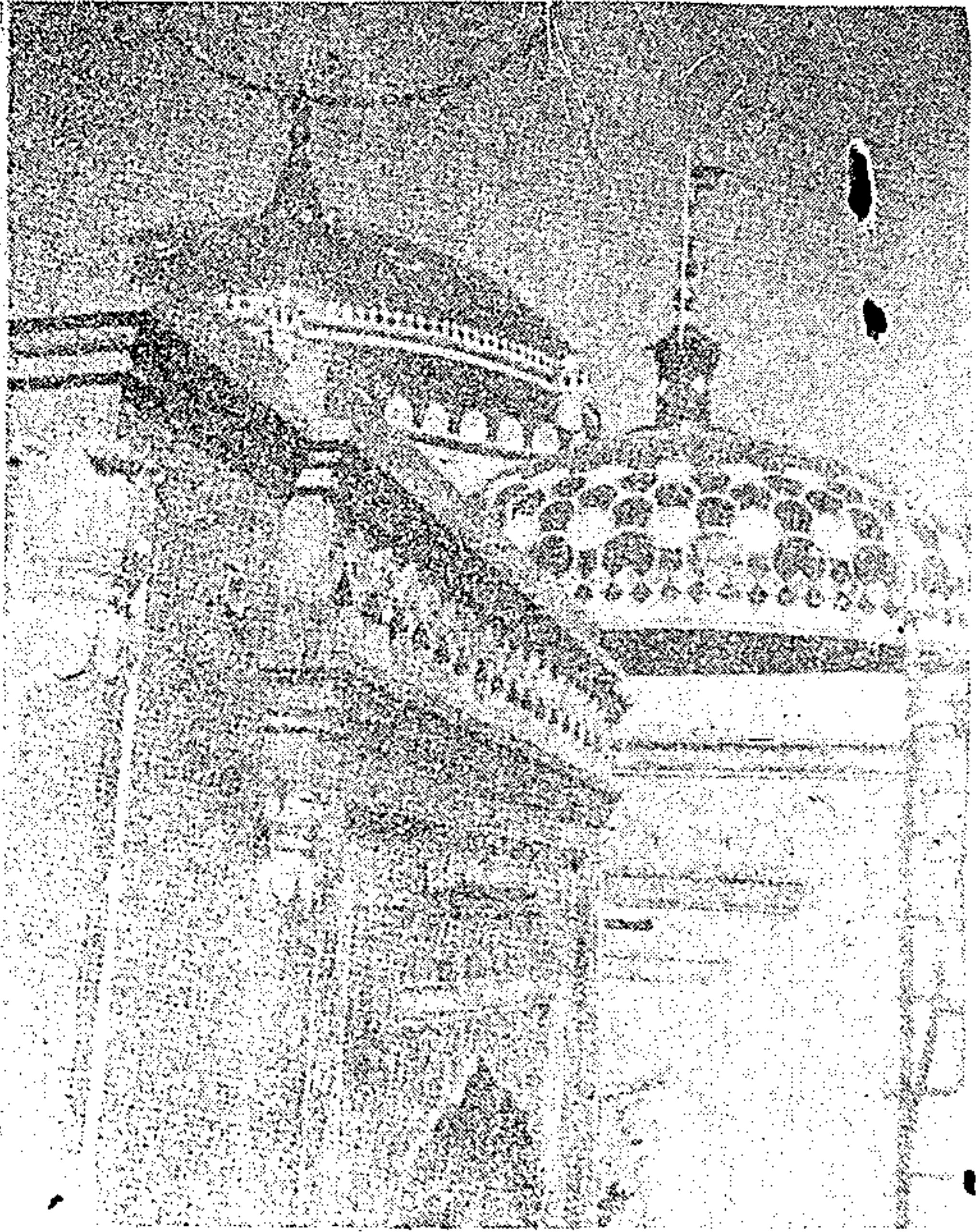
مزار مبارک حضرت بابا فریدالدین مسعود گنج شکرؒ

تاریخ وصال ۵ محرم ۶۶۴ھ

فہرست

پیش لفظ

میں بہت خوش ہوں کہ مجھے جناب جعفر قاسمی کے اس رسالے کا ، جو حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ کے متعلق ہے ، تعارف تحریر کرنے کا موقع ملا ہے :
جناب جعفر قاسمی کتابوں پر اپنے عالمانہ تبصروں اور ٹیلی وژن پر مذہبی موضوعات کی روشن خیال تشریحات کی بدولت خاصے معروف ہیں ۔ انھیں تصوف سے گہرا لگاؤ ہے اور مراکش ، الجزائر ، مصر ، شام ، فلسطین ، لبنان ، سعودی عرب اور دیگر مقامات پر بہت سے صوفیوں سے مل چکے ہیں اور مزاروں پر حاضری دے چکے ہیں ۔ آپ المغرب کے مشہور شاذلیہ سلسلے کے مرید ہیں ۔ انگلستان میں طویل قیام کے دوران میں انھوں نے صوفیانہ طرزِ زندگی سے شناسائی حاصل کی ، للہذا ان روحانی مسایل سے بڑی گہری آگاہی رکھتے ہیں جو جدید ذہن کا خاصہ ہیں ۔ بطور مصنف انھیں تصوف سے

(ب)

براہ راست آگاہی تو ہے ہی لیکن ساتھ ہی ساتھ اس فوری تقاضے سے بھی باخبر ہیں کہ ہمارے اولیاء کی تعلیمات کو متانت آمیز تاریخ کے روپ میں پیش کیا جانا چاہیے کیونکہ دنیا کی تمام عظیم روایات میں اکثر یہی ہوتا آیا کہ ولیوں کے سوانح قلم بند کرنے والے حضرات نے دو ہی مقصد سامنے رکھے : وہ یہ کہ سچائی اور عقلِ سلیم کے ملحوظات کو خاطر میں لائے بغیر انسانی روح کو فیض اور تسکین پہنچائی جائے ۔ اس قسم کی متدین اور غیر سائنسی طرزِ فکر نے عوام کی سادہ لوحی اور ضعیف الاعتقادی جیسے خواص کی بدولت (جو بذاتِ خود قابلِ ملامت نہیں ہیں) غلبہ پایا ہے چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ قصص اور فرضی حکایتوں کے ایک انبار کو صحیفۂ آسمانی کا رتبہ دے دیا گیا ہے ۔ اس اندازِ فکر کا ایک فطری شاخسانہ یہ ہے کہ ہم ہر ولی سے کرامات کی توقع رکھنے کے عادی ہو گئے ہیں اور کردار کی ان عظیم خوبیوں پر ہماری نظر نہیں پڑتی جیسے نیت کی کامل پاکیزگی ، خدا کی جملہ مخلوق کی بے لوث خدمت ، انسانوں کے مابین امن قایم رکھنے کی حوصلہ شکن جد و جہد میں ثابت قدمی اور مرد و زن کا امتیاز کیے بغیر ہر کسی کو خالقِ حقیقی کی رضا جوئی کا طلب گار بننے میں مدد دینا ۔ کہنے کا مطلب یہ نہیں کہ راہِ نجات پر چل نکلنے والے نفوس کو تقدس مآبی اور حقانیت سے کوئی کراماتی قوت

عطا ہی نہیں ہوتی بلکہ جو بات محسوس کرنے کی ہے وہ یہ ہے کہ خود اولیاء کا وجود ہی ان کی ولایت کی سب سے بڑی کرامات ہے -

فاضل مصنف نے زیرِ نظر رسالے میں انہی مسایل کی قابلِ ذکر سوجھ بوجھ کی نشان دہی کی ہے - وقت اور گنجایش کی کمی مانع نہ ہوتی تو وہ جہاں تک ممکن ہوتا اسے سیر حاصل بنانا پسند کرتے - تاہم میری رائے میں انھیں اپنے مقصد میں خاصی کامیابی حاصل ہوئی ہے ؛ اور ان کا مقصد ، جیسا کہ انھوں نے مجھے بتایا ، یہ ہے کہ ہمارے رسول صل اللہ علیہ وسلم کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے اللہ کو انسان کی نظر میں اور انسان کو اللہ کی نظر میں پیارا بنا دیا جائے - اور جناب جعفر قاسمی کا خیال ہے کہ دوسروں کو ہمارے اولیاء کی تعلیمات اور سوانح حیات سے آگاہ کرنے سے اپنی اس کوشش میں جزوی کامیابی ممکن ہے - جناب جعفر قاسمی نے اپنے مخصوص انکسار سے کام لیتے ہوئے مجھے مزید بتایا کہ اس عمل کے دوران میں خود انھوں نے جتنا کچھ سیکھا ممکن نہیں کہ وہ دوسروں کو اتنا سکھا سکیں - ان کے نزدیک ان کی موجودہ سعی کی حیثیت حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ کے سوانح اور تعلیمات پر مزید تحقیق کے لیے محض کار آموزی کی ہے -

اس میں شک نہیں کہ اس موضوع پر مزید تحقیق کی

ضرورت ہے۔ جیسا کہ مصنف کا خیال ہے کہ دوسرے امور کے علاوہ شیخ فریدؒ کے بہت سے ملفوظات ہیں، جن میں سے بعض کے مستند ہونے میں کلام نہیں، اور خواجہ عبداللہ انصاری ہراتی کے اقوال میں، جس صورت میں کہ وہ ان کے رسایل کے مجموعے کے ایک حالیہ ایرانی ایڈیشن میں موجود ہیں، متن کی مکمل یکسانیت موجود ہے۔ بہر کیف جب تک اس سمت میں مزید مساعی کے ذریعے ایسے شبہات کا ازالہ نہ ہو جائے اس وقت تک کے لیے میں ان اصحاب کی خدمت میں، جو روحانیت کے دل دادہ ہیں، بڑی گرم جوشی سے جناب جعفر قاسمی صاحب کی اس عالمانہ تصنیف کو پیش کرتا ہوں۔ یہ کہنا کوئی مبالغہ نہ ہوگا کہ اگلے صفحات پر ہمیں ایک ایسے زندہ جاوید مرد خدا کی دل پذیر اور مطبوع شبیہ ملتی ہے جس کی اعلیٰ مثال آج بھی لاکھوں انسانوں کو ولولہ عطا کرتی ہے اور جس کا پیغام ہمارے عہد اور وقت میں تازہ ہوا کے جھونکے کی مانند آیا ہے۔

اشفاق احمد

۹

پس منظر

شیخ فریدالدین مسعود گنج شکرؒ اسلام کے ازمنۂ وسطیٰ سے تعلق رکھتے تھے ۔ یہ دور نوعِ انسان کی تاریخ میں بڑی اہمیت کا حامل ہے کیونکہ اسلام اس وقت ہر شے کے علی الرغم اپنے اوجِ کمال پر تھا اور مسلمانوں کے لیے انسانی زندگی کے ہر حلقۂ عمل میں غلامانہ انداز میں دوسروں سے خیالات و تصورات مستعار لینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا ۔ اس کی شہادت کئی اور لوگوں کی طرح ممتاز مؤرخ گستاف ای ۔ وان گرون بام نے بھی دی ہے ۔ وہ اپنی کتاب " ازمنہ وسطیٰ کا اسلام " کے آخری باب میں لکھتے ہیں :

" انسانی تجربات کا مشکل سے ہی کوئی ایسا شعبہ ہوگا جس میں اسلام نے مغربی روایات کو مالا مال نہ کیا ہو ۔ ماکولات ، مشروبات ، ادویات ، فنِ جراحی ، اسلحہ سازی ، ذاتی نتابت ، صنعت و تجارت اور بحری سیاحت کے طور طریقے ، فنی ذوق و امتیاز ، علمِ ہیئت اور علمِ ریاضی غرضیکہ زندگی کے ہر شعبے میں اسلام کی قابلِ قدر خدمات کی ایک فہرست مرتب کی جائے تو وہ کئی صفحات پر مشتمل ہوگی اور پھر بھی پوری

طرح مکمل نہیں ہو گی ۔ عالم اسلام کے وجود نے یورپی تہذیب و معاشرت کو ایک نئے سانچے میں ڈھالنے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے ۔ صلیبی محاربات غالباً نہایت عظیم اور اہم مہمات تھیں جن میں قرونِ وسطیٰ کا انسان مشغول رہا ۔ مسلمانوں کی حکایات ، طرزِ بیان اور شاعرانہ تصور ، مسلم مسائلِ معاد اور مسلم تصوف کا جیالا پن غرضیکہ ان سب نے قرونِ وسطیٰ کے مغرب پر دیرپا اثرات چھوڑے ہیں ۔" (صفحہ ۳۴۲)

انسانی علم و عمل کا جو شعبہ شیخ فریدالدین[رح] نے منتخب کیا اُس کا تعلق اسلامی تصوف سے ہے ۔ شیخ[رح] مغربی پاکستان کے قصبہ کوٹھی وال میں پیدا ہوئے ۔ اُن کے والدین کابل کے ایک نجیب الطرفین گھرانے سے تعلق رکھتے تھے ۔ سلسلۂ نسب خلیفۂ ثانی حضرت عمر[رض] سے ملتا ہے ۔ شیخ فرید[رح] نوے سال کی عمر میں اجودھن میں ، جو بعد ازاں اس عظیم صوفی کی یاد میں پاکپتن کہلایا ، واصل بحق ہوئے ۔ سالِ وفات ۱۲۶۵ء ہے ۔ شیخ[رح] نے کئی دور دیکھے ۔ زندگی کے ہر شعبے سے تعلق رکھنے والے بے شمار لوگوں سے اُن کا گہرا اور قریبی رابطہ تھا چنانچہ انہوں نے انسانی فطرت کا بڑا مکمل مشاہدہ کیا اور زہد میں اپنے آبا و اجداد سے بھی سبقت لے گئے ۔ انہوں نے ازدواج سے بھی احتراز نہ کیا بلکہ ازدواج کی کڑی

سختیاں جھیلنے کو تکمیلِ روحانیت کا وسیلہ جانا ۔ شیخؒ کا خاندان خاصا بڑا تھا اور اُن کے کئی روحانی جانشین بڑے عالم فاضل اور زاہدِ مرتاض تھے ۔ اُن کے پیروکاروں کی تعداد بہت زیادہ ہے اور لاکھوں افراد اُن کی تعظیم کرتے ہیں ۔ شیخ فریدؒ ''چلۂ معکوس'' کے سوا بڑے محتاط ، باریک بیں اور سچے راسخ العقیدہ مسلمان تھے ۔ یہ یاد رکھنا مناسب ہوگا کہ شیخؒ جب اسلامی تاریخ میں اُبھرے تو تصوف کی جڑیں گہری ہو چکی تھیں ۔ تصوف کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے جتنا خود اسلام قدیم ہے ۔ اس کی اپنی روایات ہیں ، اپنے ضابطے اور اپنے رواج ہیں لیکن یہ کتنی بدقسمتی کی بات ہے کہ جب بھی ہم اسلام کے کسی عظیم عارف اور حکیم کے متعلق بات کریں تو ہمیں یہ یقین کرنا پڑتا ہے کہ وہ پرائے خیالات کا حامل ہے اور غیر اسلامی تصورات کا مقلد ہے ۔ چنانچہ یہ ضروری ہے کہ شیخ فریدالدینؒ کی زندگی اور دور کا مطالعہ کرنے سے قبل تصوف کی تاریخ اور پس منظر کی مختصراً چھان بین کی جائے ۔ ای ۔ جی ۔ براؤن اپنی معروف کتاب '' تاریخ ادبیاتِ ایران '' میں تصوف کے مبداء کے سلسلے میں چار نظریات پیش کرتے ہیں : اول یہ کہ تصوف دراصل اُن مخفی اصولوں کی نمائندگی کرتا ہے جو رسول اکرم صلعم نے اپنے خاص خاص صحابہؓ کو تعلیم فرمائے تھے ۔ دوم یہ کہ تصوف اُس ردِ عمل کا نام ہے جو آریائی اذہان پر جبراً سامی مذہب مسلط کرنے سے پیدا ہوا ۔ سوم تصوف اشراقیت

(نو فلاطونیت) کے اثرات کا نتیجہ ہے اور چہارم تصوف کی نشو و نما خود بخود بالکل آزادانہ طور پر ہوئی ہے۔ ان چاروں نظریات میں سے اس کتاب کے مصنف کے نزدیک تصوف کی تعریف میں پہلا نظریہ زیادہ معقول، دل نشیں اور قوی ہے۔ اولیائے کرامؒ کی سوانح حیات پر ہونے والے قابل ذکر کام اور صوفیوں کے روحانی سلسلوں سے بھی اس نظرے کی تائید ہوتی ہے، مزید برآں تازہ ترین تحقیق سے بھی اس کی تصدیق ہو گئی ہے۔

مثال کے طور پر پروفیسر آر۔ اے۔ نکلسن کہتے ہیں:

> "جدید تحقیق سے یہ ثابت ہو گیا ہے کہ تصوف کے مبداء کے بارے میں چھان بین سے کسی واحد اور قطعی نتیجے پر نہیں پہنچا جا سکتا۔ اس کے علاوہ تصوف کے بارے میں بنیادی طور پر جو غیر معین باتیں کہی گئی ہیں اُن سے بھی اس کی ساکھ کو نقصان پہنچا ہے۔ مثلاً یہ کہنا کہ آریائی اذہان پر جبراً سامی مذہب مسلط کرنے سے جو ردِ عمل ہوا وہ تصوف کی بنیاد ہے یا یہ کہ تصوف ہندی یا ایرانی فکر کی پیداوار ہے۔"

(آر۔ اے۔ نکلسن کی کتاب "صوفیائے اسلام" مطبوعہ لندن، ۱۹۱۴ء، صفحہ ۸)

ڈاکٹر مارٹن لنگز اپنی کتاب ''ایک جدید مسلم درویش''
میں اس مسئلے پر تفصیلاً بحث کرتے ہیں ، وہ کہتے ہیں :

صرف قانون ہی مذہب کی شاخ نہیں جیسا
کہ خلیفۂ ثانی حضرت عمرؓ کی بیان کردہ اس
روایت سے واضح ہوتا ہے ۔ حضرت عمرؓ
فرماتے ہیں :

''ایک روز ہم رسول اللہ صلعم کی خدمت میں
حاضر تھے کہ ایک اجنبی آیا ۔ اس کا لباس نہایت
سفید اور سر کے بال نہایت سیاہ تھے ۔ اس کے
چہرے پر سفر کی تھکن کے کوئی آثار نہیں تھے
اور ہم میں سے کوئی بھی اسے نہیں جانتا تھا ۔
وہ شخص رسول اللہ صلعم کے بالمقابل گھٹنے سے
گھٹنا ملا کر بیٹھ گیا ۔ اپنے ہاتھوں کی ہتھیلیاں
زانوؤں پر ٹیکیں اور کہنے لگا : ''اے محمدؐ مجھے
بتائیے کہ اسلام کیا ہے ؟'' رسول اللہ نے جواب
دیا : ''اسلام یہ ہے کہ تم اس بات کی گواہی دو
کہ خدا کے سوا اور کوئی معبود نہیں اور محمدؐ
اس کے رسول ہیں ۔ نماز پڑھو ، زکواۃ دو ،
رمضان المبارک کے مہینے میں روزے رکھو اور
اگر مقدور ہو تو حج بیت اللہ کرو ۔'' اس شخص
نے کہا : ''آپ نے سچ فرمایا ۔'' ہمیں اس بات پر

تعجب ہؤا کہ یہ شخص خود ہی سوال کر رہا ہے اور خود ہی توثیق کر رہا ہے ۔ تب اُس نے کہا : ’’ اے محمدؐ مجھے بتائیے ایمان کیا ہے ؟‘‘ رسول اللہؐ نے جواب دیا : ’’ ایمان یہ ہے کہ خدا ، اُس کے فرشتوں ، اُس کی کتابوں ، اُس کے پیغمبروں اور یومِ آخرت پر ایمان لاؤ اور اس پر یقین کرو کہ خیر و شر اللہ کی طرف سے ہے ۔‘‘ اُس شخص نے پھر کہا : ’’آپ نے سچ فرمایا ۔‘‘ تب اُس نے تیسرا سوال کیا : ’’ اے محمدؐ مجھے بتائیے احسان کیا ہے ؟‘‘ آنحضرتؐ نے جواب دیا : ’’ احسان یہ ہے کہ تم خدا کی عبادت اس طرح کرو جیسے تم اُسے دیکھ رہے ہو کیونکہ اگر تم اُسے نہیں دیکھ رہے تو وہ تمھیں دیکھ رہا ہے ۔‘‘ اس کے بعد وہ اجنبی چلا گیا ۔ میں بعد میں کچھ دیر تک رسول اللہؐ کی خدمت میں حاضر رہا ۔ حضورؐ نے پوچھا : ’’اے عمرؓ کیا تم جانتے ہو کہ سوال کرنے والا یہ اجنبی کون تھا؟‘‘ میں نے عرض کیا : ’’اللہ اور اُس کا رسول بہتر جانتے ہیں ۔ مجھے اس اجنبی کے بارے میں کچھ پتا نہیں ۔‘‘ تب رسول اللہؐ نے فرمایا : یہ جبریل تھے اور اس لیے آئے تھے کہ تمھیں تمھارا مذہب سکھائیں ۔‘‘ (مسلم ، ایمان ، ۱)

پس اسلام اپنے صحیح مفہوم میں تین شاخوں پر مشتمل ہے - اطاعت اور تسلیم و رضا یا الاسلام (کم از کم معنوں میں) ایمان اور احسان - شیخ العلاویؒ واضح کرتے ہیں کہ اسلام کے ان تینوں شعبوں میں اجتہاد کی گنجائش موجود ہے - شاخ الاسلام یعنی اطاعت اور تسلیم و رضا مختلف مکاتب قانون کی صورتوں میں معین ہوئی - شاخِ ایمان نے علمِ دین میں مختلف موشگافیوں کی شکل اختیار کی - اسی طرح شاخِ احسان بھی حضرت جنیدؒ اور دوسرے صوفیوں کے اجتہاد کے تحت مذہب کی ایک مکمل اور منظم شاخ بن گئی -

رسول اللہ صلعم نے احسان یعنی عبادت کی وضاحت لغوی اعتبار سے یوں فرمائی ہے: ''غلام کی طرح خدمت کرنا -'' اس سے نہ صرف افعال کے ایک سلسلے کی طرف اشارہ ہوتا ہے بلکہ یہ ایک دائمی صورتِ حال بھی ہے - پس ''خدا کی عبادت اس طرح کرو کہ جیسے تم اسے دیکھ رہے ہو'' کا مقصد ہے خدا کی دائمی یاد اور اس مقصد کے حصول کے لیے روحانی رہنمائی حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ خدا کا عملاً ذکر ضرور کیا جائے - یہاں درحقیقت صوفیوں کی اخوت پیشِ نظر ہے جس کے بغیر شاخِ احسان، جو اسلام کے قرونِ اولیٰ میں نسبتاً خود رو اور غیر منظم تھی، صدیوں تک وسعت پذیر نہیں ہو سکتی تھی -

(''بیسویں صدی کا ایک مسلم درویش'' مصنفہ مارٹن

لنگز ، مطبوعہ ایلن اینڈ انون ، لندن ۱۹۶۱ء ، صفحات ۴۴ - ۴۵)

تصوف کی ابتداء اگرچہ محود رسول اللہ صلعم نے کی تاہم وقت گزر نے اور اسلام کے پھیلنے کے ساتھ ساتھ مختلف ثقافتوں اور تمدنوں کے باہمی تال میل سے تصوف بھی اسلامی ادراک کی دوسری تمام شاخوں کی طرح مختلف مراحل سے گزرا اور اس کے مختلف ضوابط متعین ہوئے ، علاوہ ازیں اس سلسلے میں دو گروہ بھی معرضِ وجود میں آ گئے - ایک گروہ اس نظرے کا حامی تھا کہ تصوف کو عامۃالناس کے لیے قابلِ فہم ہونا چاہیے اور دوسرے گروہ کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ تصوف کے اصولوں کو خواص تک محدود رہنا چاہیے - ان دونوں گروہوں میں خاصی آویزش تھی - اسلامی تقویم کی تیسری صدی میں معقولیت پسند صوفیوں کے رہنما الجنیدؒ نے اپنی تحریر و تقریر میں پہلی بار تصوف کو اصول و ضوابط کی شکل دی - بعد میں لکھی جانے والی متعدد کتابوں میں ان اصول و ضوابط کو مزید باقاعدہ کیا گیا اور ان کی تشریح کی گئی - ان قدیم کتابوں میں سے سب سے زیادہ قابلِ ذکر یہ ہیں :

- طبقات النساک تصنیف سعید ابن العربی متوفی ۳۴۱ھ/۹۵۲ء
- حکایت الاولیاء تصنیف ابو محمدؒ الخلدی متوفی ۳۴۸ھ/۹۵۹ء
- کتاب اللمع تصنیف ابو نصر السراج متوفی ۳۷۸ھ/۹۸۸ء

قوت القلوب تصنیف ابو طالب المکی متوفی ۳۸۶ھ/۹۶۶ء
التعرف لمذہب اہل التصوف تصنیف ابوبکر الکلاباذی متوفی ۳۸۵ھ/۹۹۵ء
طبقات الصوفیاء تصنیف ابو الرحمان السلمی متوفی ۴۲۱ھ/۱۰۲۱ء
حلیۃ الاولیاء تصنیف ابو نعیم الاصبہانی متوفی ۴۳۰ھ/۱۰۳۸ء
الرسالہ تصنیف ابوالقاسم القشیری متوفی ۴۶۵ھ/۱۰۷۱ء
کشف المحجوب تصنیف علی الہجویری متوفی ۴۵۰ھ/۱۰۵۷ء

بعد ازاں ابو حامد الغزالیؒ (متوفی ۵۰۵ھ/۱۱۱۱ء)، ابن عربیؒ (متوفی ۶۳۸ھ/۱۲۴۰ء) اور مولانا جلال الدین رومیؒ (متوفی ۶۷۲ھ/۱۲۷۳ء) نے اس سلسلے میں کثیر اور جامع کام کیا - ہم یہ مشاہدہ کرتے ہیں کہ الغزالیؒ نے خصوصاً تصوف کی تاریخ میں بڑا مرکزی اور اہم کردار ادا کیا ہے - پروفیسر اے - جے- آربری کے نزدیک تصوف کے لیے الغزالیؒ کی خدمات بڑی مناسب ہیں - وہ لکھتے ہیں کہ آخر میں شافعی الشوافع اور اشعری الاشاعرہ حجت الاسلام محمد ابن محمد الغزالیؒ (متوفی ۵۰۵ھ/۱۱۱۱ء) نے حصول نجات کے لیے تمام طریقے آزمائے لیکن بالآخر علوم دین کے ماہرین کے جھگڑوں اور فلسفیوں کے بال کی کھال اتارنے سے بیزار

ہو گئے ۔ خود امام غزالیؒ کے الفاظ میں :

''اب مجھے یہ احساس ہوا کہ میں بے یار و مددگار ہوں تو میں نے خدا کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے ہوئے اُس کے دامن میں ایک ایسے انسان کی طرح پناہ حاصل کی جو نہایت مشکل میں ہو اور اُس کے پاس کوئی وسیلہ نہ رہ گیا ہو ۔ خدا نے میری دعاؤں کو قبول فرمایا اور میرے لیے شہرت ، دولت ، اہل و عیال اور احباب سے کنارہ کشی آسان ہو گئی ۔''

پروفیسر آربری لکھتے ہیں :

''الغزالیؒ نے صوفیاء کی سوانح حیات اور اقوال کا مطالعہ کیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ ان صوفیاء کے ظاہری افعال اور باطنی حالت شمعِ نبوت کی روشنی سے منور ہیں اور دنیا میں اور کوئی ایسی روشنی نہیں ہے جس سے ایسی درخشانی حاصل کی جا سکے ۔ چنانچہ صوفیاء کی بتائی ہوئی نہایت کٹھن ریاضت میں وہ آخر تک ثابت قدم رہے تو انھیں بھی اُس معجزاتی روشنی کا تجربہ ہوا جو صوفیاء کو عنایت ہوئی تھی ، لہٰذا انھوں نے فوراً اپنے مقلدین کو دعوت دی کہ وہ بھی خدا سے ذاتی رابطے کے اس بلند زینے

پر چڑھیں ۔

(''اسلام میں تنزیل و تعقل'' مصنفہ پروفیسر اے ۔ جے ۔ آربری ۱۹۶۵ء)

یہ بات یقینی ہے کہ شیخ فریدؒ ظاہری و باطنی اسلام کے عقلی ورثے کے پوری طرح سالک تھے کیونکہ انہوں نے علمِ دین کی مکمل اور معیاری تعلیم حاصل کی تھی ۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے باضابطہ ہدایت اور مسلسل روحانی ریاضتوں کے باعث اسلامی تصوف کے اسرار و رموز کی معرفت بھی حاصل کی ۔ اس سلسلے میں ترک سلطانوں کا شکریہ ادا کرنا چاہیے کہ ان کی سرپرستی سے اسلام پر لکھی گئیں تمام قدیم کتب محفوظ رہیں اور اکثر کے تراجم بھی ہوئے ۔ التتمش کے عہد کے ممتاز دانشور موید جورامی نے الغزالی کی عظیم کتاب ''احیاء علوم الدین '' کا فارسی میں ترجمہ کیا ۔ التتمش کے فرزند سلطان رکن الدین فیروز کے عہد میں امام رازی کی کتاب '' سرّالمکتوم '' کا بھی فارسی میں ترجمہ ہوا (''آبِ کوثر'' مصنفہ ڈاکٹر ایس ۔ ایم ۔ اکرام ، بحوالہ حافظ محمود شیرانی) ۔ تصوف کی ان فتوحات کے ساتھ ہی ہم ایک اور ترقی کا مشاہدہ کرتے ہیں ۔ تصوف کی تحریک کئی اہم سلسلوں میں منقسم ہو گئی ۔ یہ سب کچھ بارھویں صدی عیسوی میں ہوا ۔ ان سلسلوں کے بانی یکساں طور پر بڑے فاضل اور متبحر عالم و صوفی تھے اور انہوں نے اپنے پیچھے بڑی معیاری

اور بیش بہا تصنیفات چھوڑی ہیں ۔ تصوف کے سلسلوں میں سب سے پہلا اور اہم سلسلہ قادریہ ہے ۔ اس کی بنیاد شیخ عبدالقادر الجیلانیؒ (متوفی ۵۶۱ھ/۱۱۶۶ء) نے رکھی ۔ دوسرا سلسلہ سہروردیہ ہے ۔ اس کے بانی شیخ شہاب الدین عمر بن عبداللہ السہروردیؒ تھے (متوفی ۶۳۲-۵۳۹ھ/۱۱۴۴-۱۲۳۴ء) ۔ تیسرے سلسلے کا نام شاذلیہ ہے ۔ اس کا آغاز شیخ نورالدین احمد بن عبداللہ الشاذلیؒ نے کیا (متوفی ۶۵۶-۵۹۳ھ/۱۱۹۶-۱۲۵۸ء) ۔ شاذلیہ سلسلے کی ابتدا شمالی افریقہ میں ہوئی اور بعد ازاں یہ شرق اوسط میں بھی پوری طرح پھیل گیا ۔ چوتھے سلسلے کا نام مولانا جلال الدین رومیؒ (متوفی ۶۷۲ھ/۱۲۷۳ء) کے نام پر مولویہ ہے ۔ اس کی ابتدا ترکیہ میں ہوئی ۔ اگرچہ ان چاروں سلسلوں کے پیروکار برصغیر پاک و ہند میں بھی خاصی تعداد میں پائے جاتے ہیں تاہم عالمِ اسلام کے اس حصے (برصغیر پاک و ہند) میں سب سے مؤثر اور مقبول سلسلہ چشتیہ ہے ۔ پیشتر اس کے کہ اس سلسلے کے عالی مرتبت رہنما شیخ فریدالدین مسعود گنج شکرؒ کے خصوصی حوالے سے ہم اس سلسلے کی اہمیت پر بحث و تمحیص کریں ہمیں یہ بات پیشِ نظر رکھنی چاہیے کہ تصوف کے یہ تمام سلسلے علماء ظاہر کی جانب سے صوفیوں پر مسلسل جبر و تشدد کے باوجود معرضِ وجود میں آئے ۔ علماء ظاہر نے ۹۲۲ء میں منصورؒ حلاج کو بغداد میں مصلوب کیا ۔ ۱۱۳۱ء میں ہمدان کے عین القضاۃ موت کے گھاٹ اتارے

گئے اور ۱۱۹۱ء میں یحییٰ سہروردی حلب میں قتل کر دیے گئے ۔ غرضیکہ تاریخ کا کوئی دور بھی اس قسم کے جبر و تشدد سے آزاد نہ تھا لیکن اس کے باوجود علماء ظاہر صوفیوں کی لگن ، گرمیِ جذبات اور ریاضت کو ختم کرنے میں ناکام رہے ۔ خدمتِ اسلام کے سلسلے میں ان صوفیاء کرام کا طریقِ کار یہ تھا کہ یہ اپنے پیروکاروں تک رسول اللہؐ کا پیغام مثالوں کے ذریعے پہنچاتے تھے اور دکھی اور ناشاد لوگوں کو امن و سکون کی جنت مہیا کرتے تھے ۔

ان صوفیاء کے مراکز نے بھی تاریخِ اسلام میں بڑا مؤثر اور اہم کردار ادا کیا ہے ۔ سید حسین نصر نے اپنی تصنیف '' اسلام میں سائنس اور تمدن '' میں اس امر کا بڑی وضاحت سے تذکرہ کیا ہے ، وہ لکھتے ہیں :

> '' علم و فضل کے اداروں پر تبصرہ کرتے ہوئے ہمیں صوفیاء کے مراکز کو بھی پیشِ نظر رکھنا چاہیے ۔ ان مراکز کو زاویہ یا خانقاہ کہا جاتا ہے ۔ اسلام کی ابتدائی صدیوں میں یہ مراکز توقع کے مطابق صوفیوں کے اجتماعات کے مقام تھے جہاں وہ جمع ہو کر مختلف روحانی ریاضتیں اور مناجات وغیرہ کرتے تھے اور خواہش مندوں کو باطنی اسرار و رموز سے آگاہ کیا جاتا تھا ۔ یہاں وہ لوگ ، جنھیں رسمی علم سے اطمینان

نہیں ہوتا تھا اور وہ ایقان کی روشنی اور حقیقت کے براہِ راست کشف کے طالب ہوتے تھے، مکتبی علمی بحث و تمحیص یعنی قیل و قال کو خیر باد کہہ دیتے تھے اور روحانی رہنما کی ہدایت کے مطابق غور و فکر (حال) سے انبساط حاصل کرتے تھے۔ اسی لیے عارفوں اور استدلال پسندوں (یعنی باطنی علم رکھنے والوں اور ظاہری علم رکھنے والوں) کو بالترتیب صاحبانِ حال اور صاحبانِ قال کہا جاتا تھا۔ چنانچہ صوفیوں کے مراکز درحقیقت علمی مراکز ہوتے تھے لیکن وہاں جو علم سکھایا جاتا تھا وہ کتابوں میں نہیں ملتا تھا اور اس کے اکتشاف کے لیے ذہنی صلاحیتوں کی تربیت ہی کافی نہیں ہوتی تھی۔ ان مراکز میں اہل لوگ علم کی بلند ترین صورت یعنی باطنی و روحانی علم کا ادراک کرتے تھے جس کی تحصیل کے لیے روح اور ذہن کی پاکیزگی ضروری ہوتی ہے۔

منگولوں کے حملے کے بعد صوفیاء کے مراکز بہرحال ہمیشہ کے لیے بظاہر علمی اداروں کی شکل اختیار کر گئے۔ عالمِ اسلام کے مشرقی علاقوں میں منگولوں کے حملے کے نتیجے میں معاشرے

کے خارجی اداروں کی تباہی کے بعد کوئی ایسی
تنظیم نہیں تھی جو تعمیرِ نو کا کام شروع کرنے
کے قابل ہوتی ، ماسوائے صوفیوں کے سلسلوں کے
جنھیں معاشرے کے اندر معاشرہ کہا جا سکتا ہے ۔
کچھ عرصے کے لیے امنِ عامہ برقرار رکھنے اور
بہیمیت پر غالب آنے کے لیے عدل و انصاف کی
مدد کا کام بھی صوفیوں کے سلسلوں کو کرنا
پڑا ۔ چنانچہ خانقاہوں اور زاویوں میں ، جو پہلے
ہی علمی مراکز تھے ، روحانی و باطنی علوم کے
ساتھ فنی اور سائنسی علوم نے بھی پناہ حاصل کی
حالانکہ اس سے قبل یہ علوم مساجد کے مدرسوں
میں پڑھائے جاتے تھے ، لہٰذا خانقاہ کو اسلام
میں علم و فضل کے ایک نہایت اہم اور ضروری
مرکز کی حیثیت حاصل ہوگئی ۔ خانقاہیں شروع
سے ہی باطنی و روحانی علوم کے حصول کا گہوارہ
تھیں لیکن اسلامی تاریخ کے آخری دور میں انھوں
نے عالمِ اسلام کے کئی علاقوں میں مساجد کے
مدرسوں کا کام بھی شروع کر دیا ۔ پس مساجد
کے مدرسوں ، رصدگاہوں اور شفاخانوں کے ساتھ
صوفیاء کے مراکز نے بھی اپنا کردار ادا کیا
اور اسلام میں مختلف علوم و فنون کی تبلیغ اور

• آبیاری کی ذمہ داریاں پوری کیں۔
(صفحات ۹۰-۹۱)

شیخ فریدالدین ؒ نے اجودھن میں جو مہمان خانہ بنایا وہ صوفیاء کے ایک مثالی مرکز کی تمام شرائط پر پورا اترتا تھا اور اس نے عالم اسلام کے اس حصے میں اسلامی تمدن کو باطنی استحکام کا عنصر عطا کیا۔

۲

روحانی مرشد

یہ کہنا غلط ہے کہ صوفیاء برِ صغیر پاک و ہند میں غیر ملکی سامراج کے ہراول دستے کی حیثیت سے آئے - ہمارا مشاہدہ یہ ہے کہ صوفیاء برِ صغیر میں روحانیت کے مشعل برداروں اور ذات پات کے زخموں سے چور معاشرے میں انسانی عظمت کے محافظوں کی حیثیت سے آئے - سلسلہ ٔ چشتیہ کے اولیاء سے قبل کئی ایثار پسند اور بے غرض مبلغینِ اسلام مثلاً شیخ اسمٰعیل محدث ؒ، شیخ صفی الدین گزرونی ؒ، شیخ حسین زنجانی ؒ اور شیخ علی الہجویری ؒ اس ملک میں سرگرمِ کار تھے - چشتی اولیاء میں سے سب سے پہلے خواجہ ابو محمد ؒ بن ابی احمد چشتی سلطان محمود غزنوی کے عہد میں برِ صغیر میں آئے - تاہم تبلیغِ اسلام کے سلسلے میں انھوں نے کوئی کارِ نمایاں انجام نہ دیا - چنانچہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ سلسلہ ٔ چشتیہ کے پہلے ولی جو صیحح معنوں میں اس سرزمین پر اسلام کی روشنی لائے خواجہ معین الدین چشتی ؒ ہیں - اسلام کی اس عالی مرتبت اور تقدس مآب شخصیت کے بارے میں سر ٹامس آرنلڈ اپنی کتاب ”تبلیغِ اسلام“ میں لکھتے ہیں : ”ہندوستان کے اولیاء میں سے شیخ معین الدین چشتی ؒ بڑے ممتاز ہیں -“ راجپوتانے میں اسلام انھیں کی مساعیِ جمیلہ سے پھیلا - آن کی وفات ۱۲۳۶ھ میں اجمیر میں ہوئی - آن

کا وطن مالوف فارس کا مشرقی علاقہ سجستان تھا ۔ کہا جاتا ہے کہ ایک بار وہ روضۂ نبوی کی زیارت کے لیے مدینہ منورہ آئے ہوئے تھے کہ انھیں کفارِ ہند کو دائرۂ اسلام میں داخل کرنے کی ہدایت ہوئی ۔ خواب میں انھیں رسول اللہ صلعم کی زیارت ہوئی اور آنحضرتؐ نے انھیں بتایا کہ خدائے عز و جل نے ملکِ ہند تمھیں تفویض کیا ہے ، وہاں جاؤ اور اجمیر میں قیام کرو ۔ تمھارے اور تمھارے پیروکاروں کے تقویٰ کے باعث اسلام اس سرزمین میں خوب پھیلے گا ۔ خواجہ معین الدین چشتیؒ نے اس ہدایت پر سرِ تسلیم خم کیا اور اجمیر کی جانب روانہ ہو گئے ۔ اجمیر پر اس وقت ہندوؤں کی حکمرانی تھی اور تمام علاقے میں بت پرستی عام تھی ۔ خواجہ معین الدین چشتیؒ کے دستِ حق پرست پر جس شخص نے سب سے پہلے اسلام قبول کیا وہ ایک یوگی تھا جو اجمیر کے ہندو راجہ کا گرو تھا ۔ آہستہ آہستہ خواجہ معین الدین چشتیؒ کے ارد گرد خاصے پیروکار جمع ہو گئے جنھیں خواجہؒ کی تعلیمات نے الحاد و زندقہ سے جیتا تھا ۔ ایک مذہبی رہنما کی حیثیت سے خواجہؒ کی شہرت دور دور تک پھیل گئی ۔ اجمیر کے بے شمار ہندوؤں نے ان کی طرف رجوع کیا اور خواجہؒ نے ان کے سینے نورِ اسلام سے منور کیے ۔ اجمیر جاتے ہوئے راستے میں انھوں نے شہرِ دہلی میں بھی کم و بیش سات سو افراد کو دولتِ اسلام سے مالا مال کیا ۔ خواجہ معین الدین چشتیؒ کے واصل بحق

ہونے پر خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ (متوفی ۶۳۳ھ/۶-۱۲۳۵ء) اُن کے جانشین ہوئے ۔ خواجہ قطب الدینؒ وسطی ایشیا کے شہر فرغانہ کے ایک قصبے اوش میں پیدا ہوئے ۔ ابتدائی تعلیم کے بعد انھوں نے بغداد کا سفر اختیار کیا جہاں اُن کی ملاقات خواجہ معین الدین چشتیؒ سے ہوئی اور خواجہ معین الدینؒ نے انھیں طریقت سے روشناس کرایا ۔ خواجہ معین الدینؒ نے جب اجمیر کا سفر اختیار کیا تو خواجہ قطب الدینؒ بھی ایک دوسرے راستے سے اپنے مرشد کے پیچھے پیچھے روانہ ہو گئے ۔ کچھ عرصہ ملتان میں قیام کرنے کے بعد وہ دہلی تشریف لائے تو والیِ ہند سلطان التتمش نے بذاتِ خود اُن کا بڑی گرم جوشی سے استقبال کیا ۔ سلطان التتمش خواجہ قطب الدینؒ سے ہمیشہ گہری عقیدت کا اظہار کرتا رہا ۔ دوسری طرف خواجہ قطب الدینؒ نے بھی اپنے روحانی فرض سے کبھی پس و پیش نہ کیا اور ہمیشہ سلطان کو بےلاگ انداز میں یہی نصیحت کی کہ وہ غریبوں اور ناداروں پر رحم کیا کرے ۔ سلطان نے انھیں شیخ الاسلام کا عہدہ پیش کیا لیکن خواجہ قطب الدینؒ نے انکار کر دیا ۔ چنانچہ یہ عہدہ شیخ نجم الدین صغریٰ کو عطا ہوا ۔ یہ شیخ نجم الدین مختلف کینڈے کے انسان تھے ۔ مغلوب الحسد تھے اور اولیاء سے سلطان کی عقیدت کو ناپسند کرتے تھے ۔ مثال کے طور پر انھوں نے اُس دور کی مقدس شخصیت شیخ

جلال الدین تبریزیؒ پر بدکاری کا الزام لگایا لیکن اسے ثابت نہ کر سکے ۔ شاہی دربار کی سب سے بڑی مذہبی شخصیت (شیخ نجم الدین) کے اس مضحکہ خیز کردار اور برتاؤ سے شیخ معین الدین چشتیؒ بڑے آزردہ ہوئے چنانچہ انھوں نے اپنے ممتاز مرید خواجہ قطب الدینؒ کو ہدایت کی کہ وہ دہلی چھوڑ کر اجمیر میں قیام پذیر ہوں ۔ دہلی سے مرشد اور مرید کی روانگی پر نہ صرف عوام کو بلکہ خود سلطان کو بھی بڑی پریشانی ہوئی ۔ سلطان عوام کے ساتھ دونوں درویشوں کے پیچھے آیا اور خواجہ معین الدین چشتیؒ سے استدعا کی کہ وہ خواجہ قطب الدینؒ کو دہلی لوٹنے کا حکم دیں ۔ خواجہ معین الدینؒ عوام کی آہ و زاری سے پسیج گئے اور خواجہ قطب الدینؒ دہلی لوٹ آئے ۔ یہ وہی خواجہ قطب الدین ہیں جن کی چند سال قبل ملتان کی مسجد مولانا منہاج الدین میں ایک ذہین نوجوان سے ملاقات ہوئی تھی ۔ اس نوجوان کا نام فرید الدین مسعود تھا ۔ نوجوان مسعود اُن دنوں اسلامی قانون سے متعلق ایک قدیم کتاب " النافعی " کا مطالعہ کر رہے تھے ۔

ایک روز خواجہ قطب الدین نے پوچھا : " نوجوان تم کیا پڑھتے ہو ؟ " فرید الدین مسعود نے جواب دیا : " حضور ! " النافعی " ہے ۔" شیخ نے جواب دیا : " میرے بچے خدا کے فضل و کرم سے یہ کتاب تمہارے

لیے نافع ہوگی ۔'' فرید الدین مسعود چونک پڑے ۔ اُن کی نظروں کے سامنے ایک ولی کھڑے تھے جن کا کوئی ادعا نہیں تھا ، جو اسلام کے ظاہری علوم کی تحصیل کے مخالف نہیں تھے اور جن کا چہرہ امن اور نیکی کے نور سے چمک رہا تھا ۔ مسعود نے سوچا : '' کیا میں کسی ایسے ہی مرشد کی تلاش میں نہیں تھا ؟ یہ خدا کا بڑا کرم ہے کہ مرشدِ کامل خود ہی میرے دروازے پر پہنچ گئے ہیں ۔'' اور یہ حقیقت ہے کہ خدا نے ہی مستقبل کے مرشد کو مستقبل کے مرید کے پاس بھیجا تھا ۔ فرید الدین مسعود خواجہ قطب الدینؒ پر فریفتہ ہو گئے ۔ انھوں نے مرشد کے قدموں پر سر رکھتے ہوئے استدعا کی کہ مجھے مرید کیا جائے ۔ خواجہ قطب الدینؒ نے اس استدعا کو قبول کیا ۔ نوجوان مرید اپنے مرشد کی ذات بابرکات سے گویا چپک گیا اور ہر منزل میں مرشد کے نقشِ قدم پر چلنے کی سعادت حاصل کی ۔ مرشد کی پوری پوری خدمت کرکے روحانی اکملیت حاصل کرنے کے لیے فرید الدین مسعود نے ظاہری علوم کی تحصیل کو بھی ترک کرنا چاہا لیکن مرشد نے اجازت نہ دی بلکہ مرید کو حکم دیا کہ مذہبی تعلیم پر مکمل توجہ دو اور ساتھ ہی طریقت کا راستہ بھی اختیار کرو ۔ درحقیقت خواجہ قطب الدینؒ کی یہ نصیحت تصوف کی روایت کے عین مطابق تھی کیونکہ تمام عظیم صوفیاء کے نزدیک تصوف کی راہ پر چلنے والوں کے لیے

شریعت کا مکمل علم حاصل کرنا ناگزیر ہے ۔ چنانچہ فریدالدین ایسے ہونہار مرید کے لیے خواجہ قطب الدین نے تکمیل علم شریعت کو نہایت ضروری جانا اور یہ زمانے کی ضروریات کے عین مطابق بھی تھا کیونکہ اسی وجہ سے صوفیاء نے اسلام کی تبلیغ بڑے مؤثر اور دلکش انداز میں کی اور اُن کی کامیابیوں سے یہ قطعی طور پر ثابت ہوتا ہے کہ شریعت اور طریقت کی مفروضہ آویزش بہت بعد کے دور سے تعلق رکھتی ہے جب ایک محدود حلقے کو فروغ حاصل ہوا ۔ ہمارے اس دعوے کے ثبوت میں ہمارے ایک معزز ہم عصر اور تصوف کے ماہر نے بھی دلائل دیے ہیں ، وہ کہتے ہیں :

”شریعت اور طریقت کے باہمی تعلق کا اس سے بہتر اور کوئی ثبوت نہیں مل سکتا کہ دنیا کے کئی خطوں میں اسلام تصوف کے باعث پھیلا ۔ ہندوستان کے مختلف علاقوں ، جنوب مشرقی ایشیا اور افریقہ کے بیشتر حصوں میں اسلام صوفی رہناؤں کی ذاتی نظیر اور صوفیاء کے سلسلوں کے قیام سے پھیلا ۔ اس کے بعد شریعت آئی اور اسلام وسیع پیمانے پر قبول کیا گیا ۔ اگر تصوف اسلام سے علیحدہ ہوتا اور اُس کی حیثیت اسلام میں ناخوانده مہمان کی سی ہوتی ، جیسا کہ متعدد مستشرقین ہمیں باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں ،

تو پھر یہ شریعت کی توسیع کے لیے قراول کا فرض کیوں ادا کرتا ۔ شریعت اور طریقت کا یہ اندرونی رابطہ ہی تھا جس نے صوفی رہنماؤں اور اولیاء کی مدد سے دنیا کے کئی خطّوں میں اسلام کا پھیلنا ممکن بنایا کیونکہ ان صوفیاء اور اولیاء نے لوگوں کے سامنے اسلامی روحانیت کی زندہ مثالیں پیش کیں ۔ شریعت کے باطنی پہلو کی حیثیت سے طریقت کے کردار کی مکاتبِ فقہ کے مختلف بانیوں اور دوسرے ماہروں نے بھی شہادت دی ہے اور مسلم ضابطۂ اخلاق کی پاکیزگی کے لیے اس کی اہمیت پر بڑا زور دیا ہے ۔ مثال کے طور امام مالکؒ کا قولؑ ہے : جو صرف فقہ پڑھتا ہے اور تصوف سے اغماض برتتا ہے فاسق ہو جاتا ہے ۔ جو صرف تصوف پر توجہ دیتا ہے اور فقہ سے غافل رہتا ہے زندیق ہو جاتا ہے اور جو دونوں کی معرفت حاصل کرتا ہے وہ حقیقت کا سراغ پا لیتا ہے ۔

من تفقہ و لم یتصوف فقد تفسق و من تصوف و لم یتفقہ فقد تزندق ، و من جمع بینہما فقد تحقق ۔''

('' اسلام کے تصورات و حقائق'' مصنفہ سید حسین نصر ، مطبوعہ لندن ، ۱۹۶۶ء ، صفحہ ۱۲۵)

نوجوان مرید نے اپنے مرشد کی ہدایت پر عمل کیا
کم و بیش پانچ سال کے عرصے کے بعد مرشد اور مرید دہلی
میں اکٹھے ہوئے جہاں فرید الدین مسعودؒ نے اپنے شیخ کی
نگرانی میں روحانی پاکیزگی کے لیے کٹھن ریاضت کی۔ وہ شب
بیداری کرتے اور روزے رکھتے رہے۔ انھوں نے اپنی ریاضت
کی تکمیل کے لیے دعائیں اور مناجاتیں بھی کیں۔ شیخ فریدؒ
کی خوش قسمتی سے آن کے دادا مرشد شیخ معین‌الدین چشتیؒ
بھی ایک مرتبہ دہلی تشریف لائے۔ شیخ فریدؒ اپنی عقیدت
و خلوص، نفس کشی اور احترام شیخ کے جذبے کے باعث
اپنے دونوں رہناؤں کی نظروں میں سما گئے۔ دونوں مرشدوں
نے انھیں دعا دی اور آن کی کٹھن ریاضت پر اظہار پسندیدگی
کرتے ہوئے آن کے بلند مرتبے کی تعریف کی اور انھیں ہدایت
کی کہ اب وہ اپنی ریاضت کو قدرے آسان بنا لیں کیونکہ
وہ جسمانی طور پر کمزور ہو چکے تھے۔

شیخ فریدؒ نے اب خلیفہ کا مرتبہ حاصل کر لیا، یعنی
آپ کے مرشد نے آن پر اعتماد کرکے انھیں یہ اختیار دیا کہ
وہ دوسروں کو جادۂ طریقت پر چلانے کے لیے آن سے بیعت
لے سکتے ہیں اور آن کی رہنمائی کر سکتے ہیں۔ شیخ فریدؒ کے
دادا مرشد خواجہ معین‌الدینؒ نے انھیں ایک ایسے عقاب سے
تشبیہ دی جس کا آشیانہ سدرۃ المنتہیٰ پر ہو۔ انھیں ایک ایسا
چراغ قرار دیا گیا جس کی روشنی سے درویشوں کی تمام جماعت

درخشاں ہے ۔ شیخ فرید الدینؒ نے اپنی افتادِ طبع کے پیشِ نظر اپنے مرشد کی اجازت سے ہانسی جانے کا فیصلہ کیا جو پنجاب کے ضلع حصار کا ایک نہایت اہم شہر تھا ۔ انھیں توقع تھی کہ روحانی زندگی کے درجاتِ عالی کے حصول کے لیے اس شہر میں انھیں مناسب سکون اور تنہائی میسر آ جائے گی ۔ شیخ فرید الدینؒ کو الوداع کہتے ہوئے خواجہ قطب الدین بختیار کاکی نے پیش گوئی کی کہ وہ (خواجہ قطب الدین) شیخ فرید الدینؒ کی دہلی سے غیر حاضری کے دوران واصل بحق ہو جائیں گے ۔ انھوں نے یہ بھی وعدہ کیا کہ وصال کے وقت وہ شیخ فرید کے لیے کچھ تبرکات اپنے ایک اور مرید کے سپرد کر جائیں گے جن کے حصول کے بعد شیخ فریدؒ اُن کے صحیح معنوں میں جانشین بن جائیں گے ۔ گویا یہ تبرکات خواجہ قطب الدینؒ کی جانشینی کی نشانی ہوں گے ۔ ہانسی پہنچنے کے بعد شیخ فرید الدین نے روحانی ریاضتوں کے لیے ایک پروگرام ترتیب دیا ۔ انھوں نے تشہیر سے حذر کیا اور گمنامی کو پسند کیا ۔ دنیا اور اُس کے امور سے الگ تھلگ رہ کر انھوں نے روحانی تربیت کا آغاز کیا ۔ ایک رات انھوں نے خواب میں دیکھا کہ اُن کے مرشد انھیں دہلی بلا رہے ہیں ۔ صبح ہوتے ہی وہ عازمِ دہلی ہوگئے ۔ راہ میں اُن کا ایک پیغامبر سے سامنا ہوا ۔ اس پیغامبر نے ، جو ہانسی آ رہا تھا ، انھیں مرشد کی وفات

کی خبر سنائی ۔ شیخ فریدؒ نے ایک لمحہ بھی ضایع نہ کیا اور جلد از جلد دہلی پہنچ گئے ۔ وہاں انھوں نے اپنے مرشد کو خراجِ عقیدت پیش کیا ۔ خواجہ قطب الدین بختار کاکیؒ کے ایک اور مرید شیخ حمید الدین ناگوری نے شیخ فریدؒ کو موعودہ تبرکات دیے ۔ یہ تبرکات ایک خرقہ ، ایک دستار اور لکڑی کی کھڑاؤں کے ایک جوڑے پر مشتمل تھے ۔ ایک خصوصی دعا مانگنے کے بعد اُنھوں نے یہ تبرکات زیبِ تن کیے اور مرشد کے گھر پہنچ کر اُن کی جگہ سنبھالی ۔ خواجہ قطب‌الدینؒ کی یہ خواہش بھی تھی کہ شیخ فریدؒ اُن کی بیوہ سے عقد کر لیں لیکن وہ اس پر اپنے آپ کو آمادہ نہ کر سکے ۔ شیخ فریدؒ اب سلسلۂ چشتیہ کے سربراہ بن کر ایک مصروف زندگی بسر کرنے لگے ۔ اس مصروف زندگی کا ایک پہلو صحبت پسندی بھی تھا ۔ اُنھوں نے محسوس کیا کہ دعوتوں اور اسی قسم کی دوسری تقریبات میں شرکت کرنے سے اُن کا خاصا وقت ضایع ہو رہا ہے ۔ جوں جوں دارالحکومت دہلی وسیع ہوتا جا رہا تھا شیخ فریدالدینؒ کی دعوتیں اور اُن کے اعزاز میں منعقد ہونے والی دوسری تقریبات بھی بڑھتی جا رہی تھیں جس سے اُن کی توانائی اور وقت ضایع ہوتا تھا اور یہ بات شیخؒ کو ناگوار گزرتی تھی ۔ دریں اثنا ایک اور واقعہ بھی ہوا جس کی وجہ سے شیخؒ نے دہلی چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا ۔ ہانسی کا ایک

غریب انسان سرہنگا شیخ فریدالدینؒ سے ملنے کے لیے دہلی آیا لیکن کئی روز تک اُس کی شیخؒ تک رسائی نہ ہو سکی ۔ ایک صبح جب شیخؒ اپنے مکان سے برآمد ہوئے تو سرہنگا کو ، جو باہر انتظار کر رہا تھا ، موقع مل گیا ۔ وہ شیخؒ کے قدموں پر گر پڑا اور آنسو بہاتے ہوئے اور دہلی میں شیخؒ کے ناقابلِ حصول ہونے کا ماتم کرتے ہوئے بولا :
''میرے آقا ! ہانسی میں آپ سے ملنا کتنا آسان تھا ۔''
شیخ فریدؒ بڑے متاثر ہوئے ۔ انھیں بھی یادِ وطن نے بے قرار کر دیا اور انھیں بے اختیار وہ پُر امن دن یاد آ گئے جو ہانسی میں گزرے تھے ۔ انھوں نے اپنے لاتعداد مریدوں کی التجاؤں کے باوجود دہلی چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا ۔ وہ شاہی دربار ، اس کے بے روح ٹھاٹھ باٹھ اور اس کی سازشوں کی فضا سے بھی دور رہنا چاہتے تھے ۔ اگرچہ وہ حبِ جاہ سے کوسوں دور تھے تاہم انھوں نے محسوس کر لیا کہ وہ اکل کھرے لوگ ، بے راہ روی جن کی فطرت ہوتی ہے ، آن کے متعلق غلط فہمیوں کا شکار ہو جائیں گے اور انھیں اپنا رقیب سمجھنے لگیں گے ۔ خصوصاً انھیں اس بات کا بڑا خدشہ تھا کہ آن کے اور شیخ بدرالدین کے درمیان کسی قسم کی غلط فہمی پیدا نہ ہو جائے ۔ ان شیخ بدرالدین کے دل میں بھی خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کا جانشین بننے کی بڑی آرزو تھی لیکن وہ اس مرتبے کو حاصل نہ کر سکے ۔ ان

تمام باتوں کے پیش نظر شیخ فریدالدینؒ نے ہانسی کے لیے رخت سفر باندھا لیکن ہانسی پہنچنے پر بھی انھیں اسی مسئلے کا سامنا کرنا پڑا جس سے وہ دہلی میں دوچار تھے۔ خواجہ قطب الدینؒ کے جانشین کی حیثیت سے آن کی شہرت ان سے پہلے ہانسی پہنچ چکی تھی۔ چنانچہ یہاں بھی لوگ ہر وقت انھیں گھیرے رہتے تھے۔ ہر گھڑی لوگوں میں گھرے رہنے کو ناپسند کرتے ہوئے آخرکار انھوں نے اجودھن جانے کا فیصلہ کیا جس کا محل وقوع بڑا اجاڑ تھا۔ یہ مقام اگرچہ لاہور اور ملتان کے درمیان واقع تھا اور ماضی میں یہاں کئی جنگیں بھی ہوئی تھیں مگر پھر بھی یہ علاقہ بڑا الگ تھلگ تھا۔ اس کے چاروں طرف صحرا تھا۔ لوگ سرکش تھے۔ اکثریت غیر مسلموں کی تھی جن کے دلوں میں درویشوں کا کوئی احترام نہیں تھا اور نہ ہی وہ درویشوں کے معتقد تھے۔ اس علاقے میں کچھ یوگی بھی رہتے تھے جنھیں شیخؒ کی مہمان نوازی نے بڑا متاثر کیا۔ اس امر میں کوئی شک نہیں کیا جا سکتا کہ شیخ فریدؒ ممتاز صوفیوں کے اس سلسلے سے تعلق رکھتے تھے جنھوں نے کسی قسم کے مادی وسائل کی مدد کے بغیر زندگی بھر کی جد و جہد سے کفر و الحاد کے اندھیرے دور کیے۔ موجودہ دور کے مسلم دانشور ڈاکٹر عزیز احمد بھی اس بات کی شہادت دیتے ہیں، وہ لکھتے ہیں :

''ہندوستان میں آنے والے مبلغین اسلام کو ایک نظر دیکھا جائے تو وہ صوفی جو تارک الدنیا اور زاہد مرتاض تھے علوم دین کے ماہروں کی نسبت عوام کے زیادہ قریب تھے ۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ علوم دین کے ماہر متعصب و متشدد تھے اور ان میں روحانی احساس اور بلند کرداری کی بھی کمی تھی ۔ شہروں ، قصبوں اور دیہات میں صوفی اپنے مسلم مریدوں کے اندرونی دائرے اور غیر مسلم خصوصاً نیچ ذات کے ہندو مداحین کے بیرونی دائرے میں ایک محور کی حیثیت رکھتے تھے ۔ یہ غیر مسلم مداحین صوفیوں کی روحانیت اور بلند انسانی اقدار سے بڑا اچھا تاثر لیتے تھے چنانچہ بیرونی دائرہ بالواسطہ طور پر آہستہ آہستہ اسلام میں مدغم ہو جاتا تھا اور براہ راست تبلیغ کی ضرورت نہیں پڑتی تھی ۔ اس طرح یہ بیرونی دائرہ صوفیوں کی بلند کرداری سے متاثر ہو کر نور اسلام سے اپنے سینے منور کرتا اور مریدوں کے اندونی دائرے میں شامل ہو جاتا تھا ۔ کئی بار ظاہری علوم کے متوالے بھی باطنی علوم کے شیدائی ہو جاتے تھے ۔ پس صوفیوں نے بے شمار ہندوؤں کو دائرۂ اسلام میں داخل کیا ۔

لیکن یہ نو مسلم اپنے نئے مذہب کا علی الاعلان اظہار نہیں کر سکتے تھے کیونکہ انھیں اپنے ماحول کے مطابق ذات برادری کے مقاطعے کا ڈر رہتا تھا اور اس مقاطعے سے انھیں اقتصادی نقصان بھی پہنچتا تھا ۔

صوفیاء کے اکثر و بیشتر سلسلے اور متعدد صوفی ہند میں غیر مسلموں کے اسلام قبول کرنے کو اپنا اولین روحانی مقصد سمجھتے تھے ۔ ہند کے جنوبی ساحل کے موپلوں نے حضرت مالک بن دینارؒ (متوفی ۷۴۴ء) کے مریدوں کی مساعی سے اسلام قبول کیا ۔ گجرات کے ڈوڈ والے اور پنجارے الحلاجؒ (متوفی ۹۲۱ء) کی کوششوں سے ، ترچناپلی کے لبے نتھار شاہؒ (متوفی ۱۰۳۹ء) کی تبلیغ سے ، کچھ کے میمن یوسف الدین سندھی کی تبلیغ سے ، سندھ اور بلوچستان کے داؤد پوتے سندھ کے قرمطی مبلغین کی کوششوں سے ، گجرات کے بوہرے ابد اللہ خزاریؒ کی تبلیغ سے ؛ واخان کے قبائل اور آفریدی پٹھان ناصر خسروؒ کی جد و جہد سے اور گجرات کے خوجے نور ستگرؒ ایسے اسماعیلی مبلغین کی تبلیغ سے دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے ۔ غزنوی دور کے لاہور میں شیخ اسماعیل بخاریؒ نے

بڑے منظم طریقے سے تبلیغِ اسلام کا کام شروع کیا۔
اسی طرح الہجویریؒ نے غزنوی دور کے ایک
ہندو جرنیل رائے راجو کو مشرف بہ اسلام کیا۔
تیرھویں صدی میں اجمیر میں چشتی مہمان خانے
اور ملتان میں سہروردی مہمان خانے کا قیام
نہ صرف مذہبی و روحانی بلکہ ایک تبلیغی سرگرمی
کے مترادف تھا ۔ اجمیر ہندو فوجی امراء کا
گڑھ تھا چنانچہ خواجہ معین الدین چشتیؒ کی طرف
سے اسے اپنی تبلیغ کا مرکز بنانا بڑی اہمیت
رکھتا ہے ۔ اولیائے کرام کی سوانح حیات پر
ہونے والے کام کے مطابق چشتی صوفیاء میں سے
شیخ فرید الدین گنج شکرؒ اور بو علی قلندرؒ
(متوفی ۱۳۲۴ء) اپنے تبلیغی کارہائے نمایاں کی
بدولت بڑا بلند مقام رکھتے ہیں ۔ محمد بن تغلق کے
دباؤ کے باعث چشتی مبلغین نے دو پشتوں کے
تعطل کے بعد حضرت نظام الدین اولیاءؒ اور ان کے
جانشینوں کی سرکردگی میں اپنی سرگرمیاں دوبارہ
شروع کر دیں ۔

قادری سلسلے میں تبلیغ کی سربراہی سولھویں
صدی میں صرف حضرت داؤد کرمانیؒ کے ذمے
تھی ۔ بعد میں اس سلسلے سے منسلک صوفیاء

نے عام تبلیغ شروع کر دی ۔ سلسلہ کبراویہ نے
بھی بے شمار غیر مسلموں کو اسلام کی دولت سے
مالامال کیا ۔ سید علی ہمدانیؒ سات سو مشائخ کو
ساتھ لے کر کشمیر گئے اور وادیِ کشمیر کا
گوشہ گوشہ اسلام کی روشنی سے جگمگا اٹھا ۔

ان صوفی مبلغین کی پالیسی بڑی صلح کل
تھی ۔ وہ ہندوؤں اور مسلمانوں پر اپنے اصولوں
کی یکساں تبلیغ کرتے تھے اور ذکر (یعنی
غیر مسلموں کو اپنے حلقۂ اثر میں لانے کے لیے
خدا کے ناموں اور صفتوں کا تذکرہ) کی تاثیر پر
بڑا تکیہ کرتے تھے ۔"

اب ہم پھر اپنے بیان کی طرف آتے ہیں ۔ اجودھن کے
باشندوں نے شیخ فریدالدین کی طرف کوئی توجہ نہ دی ۔ شیخ
اس عدم توجہی پر بڑے خوش ہوئے ۔ انھوں نے پیلو کے
درختوں کا ایک جھنڈ منتخب کیا اور ان کے نیچے اپنا مصلیٰ
بچھا کر عبادت میں مشغول ہو گئے ۔ یہ گویا اجودھن میں
کم و بیش ربع صدی کے قیام کا آغاز تھا جس سے اس علاقے
کے نہ صرف جغرافیائی حالات تبدیل ہو گئے بلکہ پنجاب کے
کئی قبائل کا مقدر بھی بدل گیا ۔

آئیے اس مرحلے پر ایک لمحے کے لیے ذرا یہ بات
پرکھیں کہ کیا شیخ نے اجودھن کو دہلی اور ہانسی پر

محض تنہائی اور سکون کی خاطر ترجیح دی تھی ؟ کچھ لوگوں کے مطابق یہ کہنا سادہ لوحی کی انتہا ہوگی ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ شیخ سیاسی اقتدار حاصل کرنے کے بالکل خواہش مند نہیں تھے اور افتاد طبع کے اعتبار سے انھوں نے اپنی زندگی ذکر و فکر کے لیے وقف کی ہوئی تھی ۔ وہ درباری علماء سے مزاحمت کے تمام امکانات کو بھی ختم کرنا چاہتے تھے ۔ اگر وہ چاہتے تو اپنے دور کے حکمرانوں کو اپنے بے پایاں اثر کے تحت اپنا بے دام غلام بنا سکتے تھے ۔ آن کے مرشد خواجہ قطب الدین سے بھی سلطان شمس الدین التتمش بڑی محبت اور احترام سے پیش آتا تھا ۔ یہ سلطان شمس الدین التتمش خود بھی ولیوں کے سے کردار کا حامل تھا اور خواجہ قطب الدین کے واصل بحق ہونے کے صرف چند ماہ بعد خود بھی وفات پا گیا تھا ۔ ان دونوں کے تعلقات پر پروفیسر کے ۔ اے ۔ نظامی نے ان الفاظ میں بڑی جامعیت سے روشنی ڈالی ہے ، وہ لکھتے ہیں :

''ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں میں غالباً التتمش ہی وہ واحد بادشاہ ہے جسے یہ منفرد عزت حاصل تھی کہ ایک عظیم چشتی ولی اسے دوست کہہ کر مخاطب کرتے تھے ۔ واضح رہے کہ چشتی اولیاء بادشاہوں اور امراء کی صحبت سے عموماً اجتناب کیا کرتے تھے لیکن خواجہ قطب الدین کی خانقاہ

میں التتمش کا ہمیشہ خیر مقدم ہوتا تھا ۔ صوفیاء
کے مؤقف میں اس استثناء کی وجہ یہ تھی کہ
سلطان التتمش کا کردار دوسرے بادشاہوں سے
بالکل مختلف تھا ۔''

لیکن شیخ فرید کی باریک بین نگاہوں نے آنے والے دور
کو پہلے ہی دیکھ لیا تھا کہ سلطان التتمش کی وفات کے بعد
اُن کے جانشینوں میں حصول تخت و تاج کے لیے تصادم ہوگا ۔
علاوہ ازیں انھیں یہ بھی ادراک تھا کہ اسلام کا مستقبل
سیاسی دائرے سے باہر رہ کر ہی محفوظ ہو سکتا ہے ۔
مزید برآں ہندوؤں کے انحطاط پذیر رسوم و رواج کے باعث
ایک عام سماجی بے کیفی بھی موجود تھی ۔ چند مسلمان
حکمرانوں کے متکبرانہ ٹھاٹھ باٹھ سے بھی گروہ بندیوں
سے آزاد اسلامی مساوات کا آفتاب گہنا گیا تھا ۔ عوام سے
ظاہری علماء کا رویہ بھی ناقابل برداشت تھا ۔ اسلام اب صرف
انھی مقامات پر برقرار رکھا جا سکتا تھا جو جذبات سے متاثر
نہ ہوں ۔ اگرچہ اجودھن بھی جذبات سے آزاد نہ تھا لیکن
اُن کی نوعیت مختلف تھی ۔ اس علاقے کے لوگوں کی بدتمیزی
اور بے فیضی نے شیخ کے مصائب برداشت کرنے کے جذبے
کو اور مہمیز کیا ۔ نچلے طبقے کے لوگوں کی حالت خصوصاً
بڑی قابل رحم تھی ۔ انھیں کوئی سماجی حیثیت حاصل نہ تھی
اور وہ تعلیم سے بھی محروم تھے ۔ ان طبقوں کے معدودے

چند افراد نے بڑی جد و جہد کے بعد تعلیم حاصل کی اور جہالت کے چنگل سے آزاد ہو گئے لیکن اس کے باوجود انھیں احترام کے قابل نہیں سمجھا جاتا تھا ۔ بلبن کے عہد میں تو عین مین یہی حالات تھے کیونکہ وہ نچلے طبقوں اور غریب و پس ماندہ لوگوں سے بڑی نفرت کرتا تھا ۔ اُس نے نہایت بے رحمی سے ان لوگوں کو باوقار اور اعلیٰ عہدوں سے علیحدہ کر دیا ۔ حقیقتاً بلبن نے بھی بادشاہت شیخ فریدالدین کے طفیل حاصل کی تھی کیونکہ اُس نے جب الغ خاں کی حیثیت سے شیخ سے ملاقات کی تھی تو شیخ نے اُس کے حق میں دعا کی تھی ۔ پروفیسر کے ۔ اے ۔ نظامی ہمیں بتاتے ہیں کہ بلبن اپنے عہدے پر قانع نہیں تھا چنانچہ وہ حصول تخت کے لیے اُس دور کے اولیاء سے روحانی مدد حاصل کرنے کی غرض سے اولیاء کے پاس حاضری دیا کرتا تھا ۔ ایک بار دہلی کے شہنشاہ ناصرالدین محمود نے اجودھن جا کر بابا فرید سے ملاقات کرنے کی خواہش کا اظہار کیا لیکن بلبن نے اُسے اجودھن جانے سے باز رکھا ۔ اُس نے سوچا کہ اس طرح بادشاہ اپنے دور کے ایک ایسے عظیم ولی سے تعلقات استوار کر لے گا جس کا عوام پر بے پناہ اثر ہے ۔ اُس نے سلطان کو یہ پٹی پڑھائی کہ میں خود اجودھن جا کر شیخ سے آپ کا سلام عرض کر دوں گا ۔ امیر خورد لکھتے ہیں :

"غیاث الدین بلبن کو تخت حاصل کرنے کی بڑی خواہش تھی چنانچہ اُس نے یہ سوچا کہ اگر حکمرانی اُس کے مقدر میں لکھی ہوئی ہے اور شاہی تخت نے اُس کی قدم بوسی کرنی ہے تو شیخ الشیوخؒ ضرور پیش گوئی کریں گے - ان توقعات کو دل میں لیے ہوئے بلبن شیخ کی خدمت میں حاضر ہؤا اور شاہی تحائف پیش کیے - شیخ کے وجدان نے بلبن کی ذہنی کیفیات کو محسوس کر لیا چنانچہ انھوں نے یہ ابیات پڑھے :

فریدونِ فرخ فرشتہ نبود
ز عود و ز عنبر سرشتہ نبود

ز داد و دہش یافت آں خسروی
تو داد و دہش کن فریدوں توئی

(یعنی خوش قسمت فریدوں کوئی فرشتہ نہیں تھا اور نہ ہی اُس کی سرشت عود و عنبر سے بنائی گئی تھی - اُس نے خسروی داد و دہش کی بدولت حاصل کی - تو بھی داد و دہش سے کام لے کر فریدوں بن سکتا ہے -)

لیکن جب بلبن دہلی کا بادشاہ بن گیا تو اُس نے شیخ کی تعلیمات کو یکسر بھلا دیا اور معاشرے کے نچلے طبقوں کے بارے میں اُس کا

رویہ ناقابل برداشت ہوگیا ۔ اس نے عام انسانوں
سے بات کرنے سے بھی انکار کر دیا ۔ دہلی کے
ایک امیر تاجر نے بادشاہ سے ملاقات کے لیے
اپنی تمام دولت دینے کی پیش کش کی مگر اس کی
آرزو کبھی پوری نہ ہو سکی ۔ حتیٰ کہ بلبن اپنے
ذاتی ملازمین سے بھی کبھی نرم دلی کا سلوک
نہیں کرتا تھا ۔"

("ہندوستان میں مسلم حکمرانی کی بنیاد" مصنفہ
اے ۔ بی ۔ ایم ۔ حبیب اللہ ، مطبوعہ ۱۹۶۱ء ،
ص ۱۶۳)

'امیر خسرو کی تخلیقات و زندگی' کے فاضل مصنف
ڈاکٹر محمد وحید مرزا نے زیر بحث دور کے تاریخی پس منظر
کو بڑی وضاحت اور تفصیل سے بیان کیا ہے جس سے
ظاہر ہوتا ہے کہ شیخ فرید اور نظام الدین اولیاء (جن کے
امیر خسرو مرید تھے) ایسے ولی شاہی دربار کے شان و شکوہ
اور جاہ و جلال سے کیوں دور رہتے تھے ۔ چونکہ یہ ولی
ہمیشہ ذکر و فکر کے عادی تھے اس لیے شاہی دربار کا
طمطراق انھیں ناگوار خاطر ہوتا تھا ۔ حضرت بہاء الدین
زکریا ملتانی کا مؤقف اس سلسلے میں ان دونوں حضرات سے
بالکل مختلف تھا ۔ وہ ان دونوں ولیوں کے برعکس عوام سے
اجتناب کرتے تھے اور صرف اعلیٰ طبقے کے لوگوں اور

حکمرانوں کی تعلیم و تربیت پر توجہ کرتے تھے تاکہ انھیں لغزشوں سے بچایا جا سکے اور وہ راہِ راست سے بھٹکنے نہ پائیں۔ ڈاکٹر محمد وحید مرزا نے برنی کے حوالے سے اس دور کی تصویر کچھ یوں کھینچی ہے :

''برنی بھی یہی لکھتے ہیں اور ہم عوام کے رویے کی تبدیلی کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں کیونکہ یہ بات یقینی ہے کہ بوڑھا شہنشاہ بلبن آہنی ہاتھوں لیکن لاریب عقل مندی اور منصف مزاجی سے حکومت کرتا تھا ۔ تاہم اس کی سختی کے ڈانڈے کئی بار بے رحمی سے مل جاتے تھے مگر شاید یہ سختی اس افراتفری کے دور کے لیے ضروری تھی ۔ وہ اپنے عہدے داروں کے انتخاب میں بڑا سخت تھا چنانچہ اس نے تمام ذمہ دارانہ عہدوں پر اعلیٰ نسب کے افراد کو ، جو تجربہ کار ، وفادار ، عالی منش ، فیاض اور دلیر تھے ، فائز کیا ہوا تھا ۔ نالائق ، کاہل ، کنجوس اور لالچی انسان کی بلبن کے دربار میں کوئی گنجائش نہیں تھی اور وہ انھیں کوئی بڑا عہدہ نہیں دیتا تھا ۔ بلبن کو ہمیشہ اپنی شاہی زندگی زیادہ سے زیادہ 'پرشکوہ بنانے کی فکر رہتی تھی کیونکہ اس کے خیال کے مطابق شاہی وقار قائم و برقرار رکھنے کے لیے یہ

بہت ضروری تھا - برنی نے لکھا ہے کہ بلبن نے
اپنے محافظ گھوڑ سوار دستے میں ہزاروں روپوں
کے مشاہروں پر سیستانی پہلوانوں کو بھرتی کیا
تھا جو اپنے کندھوں پر ننگی تلواریں رکھ کر ان
کا تحفظ کرتے تھے اور جب بادشاہ اپنے اس محافظ
گھوڑ سوار دستے کو جلو میں لے کر باہر نکلتا تھا
تو اس کے چہرے کی دمک اور ننگی تلواروں کی
چمک سے عجب نظارہ ہوتا تھا - سورج کی
کرنیں جب ننگی تلواروں پر پڑتی تھیں تو
دیکھنے والوں کی آنکھیں چکاچوند ہو جاتی تھیں۔ بڑے
شہنشاہ کے چہرے کی دمک اور گھوڑ سوار دستے
کے جاہ و جلال سے شاہی وقار عوام کی نظروں
میں سو گنا بڑھ جاتا تھا اور وہ آب گوں آنکھوں
سے شاہی سواری کی بڑے تعجب سے تعریف
کرتے تھے - برنی کے الفاظ میں بلبن کا دربار بھی
جاہ و جلال اور شان و شکوہ کا مرقع تھا - اس
کے دربار عام میں نگران ، حاجب ، اسلحہ بردار ،
محافظ ، چوب دار ، سہم الحشام (کڑ کیت) ، ان کے
نائب ، چاؤش ، نقیب اور پہلوان اپنے اپنے
مقام پر ایستادہ رہتے تھے - دربار میں دائیں بائیں
سجے ہوئے ہاتھیوں اور ساز و سامان سے آراستہ

گھوڑوں کے پرے بھی ہوتے تھے ۔ شہنشاہ اپنے سورج کی طرح چمکتے ہوئے چہرے اور کافور ایسی سفید داڑھی کے ساتھ جب ہیرے جواہرات سے مزین تخت پر بڑے ٹھسے اور وقار سے قدم دھرتا تھا تو حاضرین کے دل لرز جاتے تھے ۔ تخت کے پیچھے خصوصی خدمت گاروں اور وفاداروں کی جگہ ہوتی تھی جب کہ ہاتھیوں کے مہاوت اور نگران ، سرجنگ دار ، خصوصی اسلحہ بردار ، میر اصطبل اور غلاموں کے امیر تخت کے دائیں بائیں ہوتے تھے ۔ اُن کے ماتحت بھی اپنے اپنے مقام پر بُتوں کی طرح ایستادہ ہوتے تھے ۔ سہم الحشام یعنی کڑکیتوں ، نقیبوں اور چاؤشوں کی گرج دار آوازیں دو کوس کے فاصلے تک سنی جا سکتی تھیں ۔ جو لوگ ان آوازوں کو سنتے تھے ، کانپنے لگتے تھے اور اکثر اوقات شاہی دربار میں موجود غیر ملکی سفراء اور دور دراز کے صوبوں کے رئیس یا رئیس زادے اور سردار ، جو شہنشاہ کو خراج تحسین ادا کرنے کے لیے دربار میں حاضر ہوتے تھے ، غش کھا جاتے تھے ۔

شان و شکوہ اور جاہ و جلال میں بلبن اپنے آقا سلطان شمس الدین التتمش سے بھی سبقت لے گیا

تھا اور اگرچہ اُس کا کڑا ضبط و نظم اور
سنجیدگی دربار میں کسی مغنی اور مسخرے کو
برداشت نہیں کر سکتی تھی تاہم وہ کبھی کبھار
شاہی ایوانوں میں بڑی بڑی دعوتیں دیتا تھا
جہاں خوب صورت قالین بچھے ہوتے تھے ۔
دسترخوان پر منقش اور دل کش رنگوں والی
طشتریاں اور سونے چاندی کے برتن چنے جاتے ۔
ایوانوں کے دروازوں پر زرتار پردے لہراتے ۔
ایوانوں کو سبز و شاداب پتوں اور نفیس
پھولوں سے سجایا جاتا اور حاضرین کو لذیذ
کھانے ، عمدہ پھل ، خنک شربت اور گلوریاں
پیش کی جاتی تھیں ۔ اس موقعے پر مغنی ہلکے
سروں میں ساز بجاتے تھے اور شعراء مدحیہ قصائد
پڑھتے تھے ۔" (ص ۲۶-۲۷)

ان حالات کے باوجود شیخ فرید نے ایک بالکل ہی
مختلف قسم کی مثال قائم کی ۔ اُن کی خانقاہ کے دروازے
ہر قسم کے آدمیوں کے لیے کھلے تھے ۔ اُن کی بارگاہ میں
شہزادوں اور محتاجوں سے یکساں سلوک ہوتا تھا ۔ اُس دور
کے حکمرانوں نے کئی مرتبہ شیخ کو جاگیریں دینے کی
کوشش کی مگر شیخ نے انکار کر دیا کیونکہ انھوں نے
یہ فیصلہ کر رکھا تھا کہ وہ کسی قسم کی املاک کے مالک

نہیں بنیں گے اور تمام زندگی ایک غریب کاشت کار کی طرح بسر کریں گے - آن کی اسی زریں مثال کے باعث بے شمار غیر مسلموں نے اسلام قبول کیا - تبلیغِ اسلام میں آن کا وہی درجہ ہے جو آن کے دوست اور رشتےدار شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی کا ہے - بابا فرید کی تبلیغ سے کم و بیش سولہ قبائل نے اسلام قبول کیا - خانقاہ میں شیخ کے اہلِ خاندان کے لیے کچی اینٹوں کی ایک جھونپڑی تھی - کچی اینٹوں کا ہی ایک بہت بڑا کمرہ تھا جس میں فقراء قیام کرتے تھے اور روحانی ریاضتیں کرتے تھے - اس کے علاوہ ایک مسجد تھی - خانقاہ زائرین ، ضرورت مندوں اور مسافروں کے لیے آدھی رات تک کھلی رہتی تھی - فتوح کو فقراء میں جلد از جلد تقسیم کر دیا جاتا تھا اور اعلیٰ و ادنیٰ میں کوئی امتیاز روا نہیں رکھا جاتا تھا - یہ خانقاہ آن لوگوں کے لیے حقیقی معنوں میں جائے پناہ تھی جو دنیا کے جھگڑوں اور خود غرضیوں سے تنگ آ کر کچھ لمحے امن و سکون میں گزارنے کے لیے آتے تھے - یہ خانقاہ چھوٹے پیمانے پر ایک فلاحی مملکت بھی تھی اور اس ننھی سی فلاحی مملکت کو اس وجہ سے فضیلت حاصل تھی کہ مادی اشیاء میں تو تمام لوگ حصہ دار تھے لیکن مکینوں کی روحانی فلاح و بہبود پر صرف شیخ ہی توجہ دیتے تھے - شیخ کئی برس تک اس حیرت انگیز ادارے کے سربراہ رہے - اس دوران میں انھوں نے

پند و نصائح اور ذاتی مثال سے مبتدیوں کی ہر طرح مدد کی تاکہ وہ ذاتی پاکیزگی کی جد و جہد میں کامیاب ہو کر خدائی علوم حاصل کر سکیں ۔ شیخ نے مختصر سی علالت کے بعد ۵ محرم الحرام ۶۶۴ھ کو وفات پائی ۔ علالت کے آخری ایام میں انھوں نے اپنے پیارے مرید شیخ نظام الدین اولیاء کو الوداع کہی اور وہ دہلی روانہ ہوگئے ۔ شیخ فریدالدین کی وفات کے بعد شیخ نظام الدین اولیاء اُن کے جانشین بنے اور انھوں نے مرشد کے بعد سلسلۂ چشتیہ کی روایات کو برقرار رکھا ۔ جس رات شیخ فرید نے جان جانِ آفریں کے سپرد کی اُس رات وہ تین بار بیہوش ہوئے ۔ جب انھیں ہوش آتا تو وہ حاضرین سے پوچھتے کہ کیا انھوں نے عشاء کی نماز ادا کر لی ہے ؟ اُس رات شیخ نے تین مرتبہ عشاء کی نماز پڑھی اور یہ کہتے رہے : ”کون جانے کیا ہوگا ۔“ اس کے بعد یہ عظیم انسان دنیا سے کلیتاً منہ موڑ کر ذکر و فکر میں مشغول ہو گیا ، حتیٰ کہ اُن کی روح نے جسم کا ساتھ چھوڑ دیا ۔ آخری وقت ان کی زبان پر یا حیُ یا قیوم کے الفاظ تھے ۔

شیخ کی وفات پر اُن کے اہل خاندان کے پاس اتنی رقم بھی نہ تھی کہ وہ کفن اور قبر کے لیے کچی اینٹیں خرید سکیں ۔ چنانچہ قبر بنانے کے لیے جھونپڑی کے دروازے سے اینٹیں نکالی گئیں ۔ شیخ نے اپنے پیچھے پانچ صاحب زادے

اور تین صاحب زادیاں چھوڑیں ۔ اُن کی اولاد میں سے کئی لوگ بڑے اونچے مرتبے کے صوفی ہوئے ۔ شیخ کی اولاد اب بھی موجود ہے اور عوام اُس کا بڑا احترام کرتے ہیں ۔ بدقسمتی سے شیخ کی اولاد نے بعد میں ترک دنیا کا راستہ چھوڑ دیا جیسا کہ اس عبارت سے اس امر کی شہادت ملتی ہے :

''تغلق سلطان شیخ فرید کے خاندان کا بڑا احترام کرتے تھے کیونکہ دیپال پور ، جو خاندان تغلق کے بانی کا علاقہ تھا ، پاکپتن سے زیادہ دور نہیں تھا ۔ ''جواہر فردی'' کے مصنف دعویٰ کرتے ہیں کہ تغلق خاندان کے بانی ملک غازی نے شیخ فرید کے صاحب زادے شیخ علاء الدین کی دعا سے ہندوستان کی بادشاہت حاصل کی تھی ۔ یہی وجہ ہے کہ محمد تغلق نے بابا فرید کی خانقاہ کے اندر شیخ علاء الدین کا بڑا عظیم مقبرہ تعمیر کرایا ۔ اسے مغربی پاکستان میں مسلم فن تعمیر کی پہلی معیاری یادگار کہا جا سکتا ہے جس کا اس سے قبل مشاہدہ نہیں کیا گیا تھا ۔ محمد تغلق شیخ علاءالدین کے دو صاحب زادوں معزالدین اور عالم‌الدین کو اپنے ساتھ دہلی لے گیا ۔ معزالدین کو اس نے گجرات کا گورنر اور عالم‌الدین کو ہندوستان کا شیخ الاسلام

مقرر کر دیا اگرچہ اس سے قبل یہ خاندان
حکومت کے امور میں مداخلت سے اجتناب کرتا
تھا ۔ شیخ کی اولاد کے سرکاری عہدوں پر فائز
ہونے کو کچھ لوگ تصوف کے سلسلۂ چشتیہ کی
روایات سے انحراف قرار دیتے ہیں ۔‘‘
(’’پاکپتن اور بابا فریدگنج شکرؒ‘‘ مصنفہ ڈاکٹر
ایم ۔ عبد اللہ چغتائی ، ص ۲۸)

صدیوں تک اس خانقاہ کے ساتھ خاصی املاک رہی
کیونکہ عوام اور حکمران مسلسل مختلف نوعیت کی جائدادیں
خانقاہ کے لیے وقف کرتے رہے ۔چونکہ اس امر کا خدشہ
تھا کہ روحانیت کے موروثی نظام کے تحت اس وسیع خیراتی
وقف املاک کے نظم و نسق میں بدعنوانیاں نہ پیدا ہو جائیں
اس لیے چند سال قبل محکمہ اوقاف نے اس خانقاہ کو اپنی
تحویل میں لے لیا ۔ ہر سال ۵ محرم کو بابا فرید کا سالانہ
عرس منایا جاتا ہے جس میں پاکستان اور بھارت کے مختلف
علاقوں سے بے شمار افراد شرکت کرتے ہیں ۔ کیونکہ شیخ کی
اولاد کا عوام کے دلوں میں بڑا احترام ہے اس لیے
دیوان صاحب ، جو شیخ کی اولاد میں سے ہیں اور آن کے
وارث ہیں ، عرس کی تمام تقریبات میں شرکت کرتے ہیں
تاکہ ان کا وقار بڑھے اور یہ تقریبات عوام میں مقبول ہوں۔

۳

شیخ کے سفر

شیخ فرید کی تعلیمات پر بحث و تمحیص سے قبل یہ ضروری ہے کہ اُن کے سفروں کی تعداد کے سوال کو حل کر لیا جائے ۔ سفر بسا اوقات ایک صوفی کی تربیت کا حصہ ہوتا ہے اور تصوف کی کئی کتابوں میں سفر کے مقاصد اور آداب پر ہدایات بھی ملتی ہیں ۔ فارسی میں لکھی ہوئی تصوف کی اولین کتاب کشف المحجوب میں ، جو شیخ علی الہجویری کی تصنیف ہے ، ایک صوفی کے سفر کے لیے حسب ذیل قوانین کا تذکرہ کیا گیا ہے :

> ''سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ صوفی کو سفر ضرور کرنا چاہیئے تاکہ اُس کے دل میں باطنی نفسانی خواہشات سے نفرت پیدا ہو سکے ۔ صوفی کے لیے لازمی ہے کہ وہ ہمیشہ پاکیزگی کی کیفیت میں رہے اور اپنی ریاضت سے غفلت نہ برتے ۔ اُس کے سفر کا مقصد یا تو حج یا کفر و الحاد کے خلاف جہاد یا مقاماتِ مقدسہ کی زیارت یا حصولِ علم کے لیے کسی مقدس ہستی یا شیخ کے پاس حاضری یا کسی بزرگ ولی کے مقبرے کی زیارت ہونا چاہیے ۔ ان کے علاوہ

کسی اور مقصد کے لیے سفر کرنا غلط ہوگا ۔
سفر کرنے والے درویش کو ہمیشہ ہادیِ اعظم
کے مسلک پر کاربند رہنا چاہیے ۔ سفر کے اختتام
پر جب درویش کسی کے گھر میں داخل ہو تو
اسے (درویش) ادب و احترام سے کام لینا چاہیے
اور صاحبِ خانہ کو سلام کرنا چاہیے ۔ تب
اسے پہلے بائیں پاؤں کا جوتا اتارنا چاہیے جیسا کہ
ہادیِ اعظم کیا کرتے تھے اور جب اسے جوتا
پہننے کی حاجت ہو تو پہلے دائیں پاؤں میں جوتا
پہننا چاہیے ۔ اسی طرح اسے پہلے دایاں پاؤں
دھونا چاہیے اور پھر بایاں اور پھر دو بار سر
جھکا کر اہلِ خانہ کو سلام کرنا چاہیے ۔ اس
کے بعد اسے وہ تمام مذہبی فرائض سرانجام دینے
چاہییں جو درویشوں کے لیے لازمی ہوتے ہیں ۔
اسے کسی بھی حالت میں اہل خانہ کے معاملات
میں مداخلت نہیں کرنی چاہیے ۔ نہ ہی کسی کے ساتھ
حد اعتدال سے بڑھ کر کسی قسم کا برتاؤ کرنا
چاہیے ۔ نہ ہی اپنے سفر کی مشکلات بیان کرنی
چاہییں ۔ نہ ہی علم دین پر بحث و تمحیص کرنی
چاہیے ۔ نہ ہی حکایات بیان کرنی چاہییں اور نہ ہی
حاضرین کو مختلف احکام و عقائد بتانے چاہییں

کیونکہ یہ سب باتیں نخوت و خود بینی کی غماضی کرتی ہیں - اگر بیوقوف لوگ دق کریں تو صوفی کو صابر و شاکر رہنا چاہیے اور شریروں کی طرف سے پہنچنے والی تکالیف فی سبیل اللہ برداشت کرنی چاہییں کیونکہ صبر میں بڑی برکتیں ہوتی ہیں - اگر اہل خانہ یا اُن کے ملازم صوفی کو شہر کے لوگوں سے ملانے کے لیے باہر لے جانے کو کہیں تو اُسے اُن کی بات مان لینی چاہیے لیکن دل میں دنیادار لوگوں سے ملنے اور اُن کا احترام کرنے کو ناپسند کرنا چاہیے لیکن اُن کے جو بھائی ایسا کرتے ہوں اُن کے رویے پر نکتہ چینی نہیں کرنی چاہیے - ایک صوفی کو اس بات کا دھیان رکھنا چاہیے کہ اُس کے غیر مناسب مطالبات سے اہل خانہ کو تکلیف نہ پہنچے اور نہ ہی ذاتی خوشی کے لیے اُسے اہل خانہ کو اُمراء یا اعلیٰ حکام کی بارگاہ میں کھینچنا چاہیے - سفر کرنے والے درویشوں اور ایک ہی جگہ مقیم رہنے والے درویشوں کو ہمیشہ باہم مل کر خدا کی رضائیں حاصل کرنے کی سعی کرنی چاہیے اور ایک دوسرے پر اعتماد کرنا چاہیے۔ صوفی کو اپنے کسی ساتھی کے منہ پر یا اس کی

عدم موجودگی میں تلخ باتیں نہیں کرنی چاہییں
کیونکہ ایک سچے صوفی کی نگاہ عمل کے معاملے
میں ہمیشہ قوت عاملہ پر ہوتی ہے اور جہاں تک
انسان کا تعلق ہے وہ چاہے کسی بھی نوع کا
ہو ، بے عیب ہو یا عیب دار ہو ، چھپا رستم ہو
یا کھلی اور واضح طبیعت رکھنے والا ہو خدا کا
بندہ اور اس کی مخلوق ہے ۔ کسی عمل پر خدا
کی مخلوق سے جھگڑا کرنا گویا خدا سے جھگڑا
کرنا ہے ۔''

(آر ۔ اے ۔ نکلسن کا ترجمہ ، صفحات ۳۴۶-۳۴۷)

شیخ کے کئی ممتاز پیش روؤں نے بڑے لمبے سفر کیے ہیں ۔ شیخ فرید سے منسوب کئی سفروں کو شاید کچھ مصنفین نے شرح و بسط سے بیان نہیں کیا تاہم شیخ نے ملتان ، اوچ شریف ، قندھار ، دہلی اور ہانسی کا سفر کیا اور ان مقامات پر کافی عرصے تک قیام پذیر رہے ۔ البتہ کشمیر ، شمالی ہند ، وسطی ایشیا ، شرق قریب اور شرق اوسط ایسے دور دراز علاقوں کے سفر کچھ مصنفین کے نزدیک مشتبہ اور غیر مستند ہیں ۔ پروفیسر کے ۔ اے ۔ نظامی ان سفروں کو مسترد کرنے کے لیے حسبِ ذیل وجوہ پیش کرتے ہیں :

۱۔ اولیں کتابیں 'فوائد الفواد' ، 'خیر المجالس'

اور 'سیر الاولیاء' میں شیخ فرید کی غیر ملکی
سیر و سیاحت کے بارے میں ایک لفظ بھی درج
نہیں ہے - اگر بابا فرید نے اتنے وسیع سفر کیے
ہوتے ، جیسا کہ جعلی ملفوظ لٹریچر ہمیں باور
کرانے کی کوشش کرتا ہے ، تو امیر حسن اور
امیر خورد نے یہ حقیقت کیوں واضح نہیں کی ؟
بعد کے مصنفین مثلاً جمالی ، علی اصغر اور اللہ دیا
کے نزدیک شیخ نے غیر ملکی سفر کیے ہیں -
ان کی معلومات کا ایک ہی ذریعہ ہے ، اس دور
کا غیر مستند لٹریچر ، حکایات اور کہانیاں جو
ان تک پہنچیں -

۲- جس زمانے میں فرض کیا جاتا ہے کہ بابا فرید
نے غیر ملکی سفر کیے وہ ہولناک ہلچل اور
اضطراب کا زمانہ تھا - منگولوں کی تاخت نے
کئی سرسبز و شاداب اسلامی شہروں کو تباہ و
برباد کر دیا - مشرق اسلامی ممالک کے ثقافتی
مراکز تو حقیقی معنوں میں صفحۂ ہستی سے
نیست و نابود ہوگئے - جہاں پہلے شاہی محل اور
کتب خانے تھے وہاں صحرا اور کھنڈر نمودار
ہوگئے -
("تاریخ عرب" مصنفہ پی - کے - ہیٹی ، صفحات

(۳۸۲-۳۸۳)

حتیٰ کہ ابن بطوطہ نے بھی جن دنوں بخارا ، سمرقند ، بلخ اور ماوراء النہر کے دوسرے شہروں کی سیاحت کی تھی تو یہ شہر کھنڈروں میں تبدیل ہو چکے تھے ۔ ان حالات کے تحت تاجروں ، سیاحوں اور صوفیوں کے لیے سفر کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا ۔ اس کے علاوہ ان علاقوں کے مہاجرین کا ایک لامتناہی سلسلہ پناہ حاصل کرنے کے لیے ہند میں داخل ہو رہا تھا ۔

۳۔ بابا فرید کے روحانی مرشد چونکہ ہند میں مقیم تھے اس لیے غیر معین حالات کے تحت بابا فرید کے لیے غیر ملکی سفر ضروری نہیں تھا ۔

ان حقائق کے پیش نظر یہ بات بعید از قیاس ہے کہ بابا فرید نے کسی بھی غیر ملک کا سفر کیا ہو ۔ تاہم ایک استثنیٰ ضرور ہے اور وہ ہے سفر قندھار ۔ بابا فرید نے یہ سفر بارھویں صدی کے آخری عشرے میں تکمیل علم کے لیے کیا تھا ۔

(''شیخ فریدالدین گنج شکر کی زندگی اور دور'
مصنفہ پروفیسر کے ۔ اے ۔ نظامی ، ۱۹۵۵ء ،
مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ، صفحات ۲۹-۳۰)

اس سلسلے میں ایک نقطہ یہ بھی ہے کہ
ازمنہ وسطیٰ کے ہند کے باہر جو تغیر پذیر
حالات تھے شاید ان کے باعث مسلم دانش ور
بیرون ملک سفر کرنا غیر ضروری سمجھتے تھے
علاوہ ازیں تاراج علاقوں کے دانش ور
ہجوم در ہجوم دہلی پہنچ چکے تھے اور جہاں تک
ذہنی و روحانی ضرورتوں کا معاملہ تھا شہر دہلی
کچھ عرصے کے لیے خود کفیل ہو چکا تھا -
(''ازمنہ وسطیٰ کے ہند کی تاریخ کا مطالعہ''
مصنفہ کے - اے - نظامی ، ۱۹۵۶ء)

ان تمام باتوں کے باوجود شیخ کی ہمہ جہتی خیر و برکت
کا سلسلہ بہت وسیع ہے - اُن کے سفروں کے بارے میں اگر
کوئی شک ہو بھی تو یہ بات شک سے بالاتر ہے کہ آن کا
اثر بہت دور دور تک پہنچا ہوا تھا - ''بنگال میں صوفی ازم
کی تاریخ'' کے فاضل مصنف ڈاکٹر انعام الحق کے مطابق
شیخ فرید نے ایک مرتبہ بنگال کا سفر بھی کیا تھا - انھوں
نے لکھا ہے کہ مشرق پاکستان میں چاٹگام کے قریب ایک
چشمہ ہے جس کا نام شیخ کے نام پر ہے - ڈاکٹر انعام الحق
نے فرید پور کے باشندوں کے اس عقیدے کا حوالہ بھی
دیا ہے کہ مشرق پاکستان کے ضلعے فرید پور کا نام بھی
شیخ فرید کے نام پر رکھا گیا ہے کیونکہ انھوں نے اس

ضلعے میں اسلام کی تبلیغ کی اور کئی مقامات پر پہنچ کر بے شمار لوگوں کو مسلمان کیا ۔ ڈاکٹر انعام الحق شہر فرید پور میں ایک قبے کا بھی پتا دیتے ہیں جو ان کے مطابق شیخ کی آمد کی یادگار ہے ۔ تاہم ''تذکرہ صوفیاء بنگال'' کے فاضل مصنف مولانا اعجاز الحق قدوسی نے ، جو برصغیر پاک و ہند میں تصوف پر اتھارٹی تسلیم کیے جاتے ہیں ، ڈاکٹر انعام الحق کے نظریات کو باوجود اس کے کہ وہ بہت مقبول ہیں مسترد کیا ہے ۔ مولانا قدوسی اس سلسلے میں یہی دلیل پیش کرتے ہیں کہ کسی بھی تذکرے میں ایسا کوئی حوالہ نہیں ہے ۔

بہرحال راقم الحروف کے نزدیک شیخ فرید نے ملتان میں اپنے مرشد سے ملاقات کے بعد دہلی میں انہیں دوبارہ ملنے کے درمیانی عرصے میں وسطی ایشیا ، شرق قریب اور شرق اوسط کا سفر کیا کیونکہ شیخ اس زمانے میں اپنی مذہبی تعلیم مکمل کر رہے تھے ۔ اگر حصول تعلیم کے لیے وہ قندھار جا سکتے تھے تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ آگے جانے سے اجتناب کرتے ۔ مزید برآں شیخ اس وقت نوجوان تھے اور ہنگامہ خیزی کے اس دور میں طویل سفر کی صعوبتیں برداشت کرنے کی قوت رکھتے تھے ۔ حصول علم کے لیے سفر اختیار کرنا پیغمبرانہ روایت ہے اور اس کے ساتھ بڑی خوبیاں وابستہ ہیں ۔ سو یہ بات بالکل ہی خارج از امکان نہیں

کہ شیخ فرید نے ایشیا اور افریقہ کے کئی اسلامی ملکوں کا سفر اختیار کیا ۔

دوم محض یہ حقیقت کہ پہلے زمانے کے اولیاء کے سوانح نگاروں نے کچھ مقامات کا تذکرہ نہیں کیا استرداد کے لیے مناسب وجہ نہیں جیسے کہ آن کا بیان شیخ کی زندگی کی تمام تفصیلات کے بارے میں محتوی قرار نہیں دیا جاسکتا ۔ ہمارے خیال میں زبانی اور سنی سنائی روایت کو تاریخی علم کے ایک ذریعے کی حیثیت سے کتاب پرستی کے نظریے سے مربوط نہیں کرنا چاہیے ۔

المختصر عالم اسلام کے کئی مقامات ایسے ہیں جو بابا فرید کے باعث بھی قابلِ احترام ہیں ۔ سید مسلم نظامی نے اپنی تصنیف ''انوار الفرید'' میں کم و بیش پچیس مقدس مقامات کا ذکر کیا ہے جہاں شیخ نے چلّے اور مراقبے کیے ۔ ان مقامات میں مدینہ منورہ ، بیت المقدس حتٰی کہ برما کا ایک شہر بھی شامل ہیں ۔ توفیق کنعان نے اپنی کتاب ''فلسطین کے مسلم اولیاء اور عبادت گاہیں (۱۹۲۷ء)'' میں یہ قول نقل کیا ہے کہ فلسطین میں ایک زاویہ ہے جس کا نام شیخ فرید گنج شکر کے نام پر ہے ۔ سید محمد لطیف نے اپنی تصنیف ''لاہور ، اس کی تاریخ اور آثار قدیمہ (۱۸۹۲ء)'' میں بابا فرید کے ایک چلّے کا تذکرہ کیا ہے جو شیخ نے لاہور کی موجودہ ضلع کچہری کے مغرب میں واقع ایک اونچے ٹیلے

پر کیا تھا ۔ تقسیم ملک سے قبل ہر سال ۵ محرم کو مسلمان
اور ہندو مل کر یہاں میلہ مناتے تھے ۔ مختصر یہ کہ ہم
چاہے شیخ کے سفروں کی تعداد اور حدود کو متعین نہ
کر سکیں تاہم شیخ ایک ایسے ولی ہیں جن کی خیر و برکت
دور دور تک پھیلی ہوئی ہے ۔

۴

شیخ کی شخصیت اور تعلیمات

شیخ فرید کی جو بات سب سے زیادہ متاثر کرتی ہے وہ ہے مصائب کے لیے اُن کی محبت۔ انھوں نے تکالیف کا راستہ اختیار کیا اور شہرت پر گمنامی کو ترجیح دی۔ توطن کے لیے اجودھن کو منتخب کرنے سے متعلق اُن کا فیصلہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ وہ ایک الگ تھلگ اور گمنام علاقے میں جی بھر کر عبادت، ریاضت، مراقبہ اور مناجات کرنے کے خواہش مند تھے۔ مزید برآں اجودھن میں قیام کرنے کا مقصد یہ بھی تھا کہ زندگی انتہائی کٹھنائیوں میں بسر کی جائے۔ یہ علاقہ نہ صرف ناخوش گوار تھا بلکہ غیر محفوظ بھی تھا چنانچہ شیخ کے کئی مریدوں کو سانپوں نے ڈسا۔ شیخ اور اُن کے مریدوں کو زیادہ تر جنگلی پھلوں مثلاً پیلو اور ڈیلا اور بدمزہ سبزیوں پر بسر اوقات کرنا پڑتی تھی۔ جب حالات انتہائی کٹھن ہو جاتے تھے تو ایک مرید کاسۂ گدائی لے کر شہر جایا کرتا تھا اور خوراک جمع کر کے لایا کرتا تھا۔ فتوح لی جاتی تھی اور مستحقین میں بانٹ دی جاتی تھی۔ مریدوں میں کوئی امتیاز روا نہیں رکھا جاتا تھا حتیٰ کہ پارسائی کو بھی وجہ تفاخر نہیں سمجھا جاتا تھا اور شیخ کے ممتاز مریدوں مثلاً شیخ نظام الدین اولیاء، مخدوم علاء الدین صابر، شیخ بدر الدین اسحاق اور متعدد

دوسروں کو چھوٹے موٹے اور معمولی کام تفویض کیے جاتے تھے۔

شیخ کی شخصیت کی ایک اور خصوصیت جو اُن کی تعلیمات سے براہِ راست نسبت رکھتی ہے اُن کا عزم محکم ہے۔ جب وہ ایک بار عزم کر لیتے تھے تو پھر کوئی بھی اُن کے عزم میں مانع نہیں ہو سکتا تھا۔ مثال کے طور پر اجودھن پہنچنے کے تھوڑے عرصے بعد اُنھوں نے اپنے چھوٹے بھائی شیخ نجیب الدین متوکل کو کوٹھی وال بھیجا کہ وہ والدہ کو اجودھن لے آئیں۔ واپسی پر شیخ نجیب الدین متوکل والدہ محترمہ کو ایک جگہ بٹھا کر خود صحرا میں پانی تلاش کرنے کے لیے چلے گئے اور وہ قابل احترام خاتون جنگلی درندوں کے حملے سے جاں بحق ہو گئیں۔ شیخ فرید کی زندگی کا یہ پہلا بڑا المیہ تھا کیونکہ اُن کی والدہ نے اُن کی زندگی سنوارنے میں بڑا اہم اور مرکزی کردار ادا کیا تھا۔ اُن کی والدہ نے زہد کے رستے پر ثابت قدم رہنے کے لیے ہمیشہ اُن کی حوصلہ افزائی کی۔ درحقیقت یہ بزرگ خاتون کاملیت کی حامی اور شیخ کی نہایت سخت گیر اتالیق تھیں۔ انھوں نے ہمیشہ اپنے فرزند پر یہی زور دیا کہ چاہے کتنی ہی بڑی قربانی کیوں نہ دینی پڑے وہ اپنی روحانی قوتوں کا زیادہ سے زیادہ ادراک کریں۔ اس محترم خاتون نے ہر حال میں مردانہ وار بیٹے کا ساتھ دیا لیکن ایسی والدہ کی وفات

سے بھی اجودھن میں رہنے سے متعلق شیخ کا عزم متزلزل نہ ہؤا ۔ انھوں نے دنیا کی شان و شوکت سے الگ رہنے کا فیصلہ کیا ہؤا تھا چنانچہ انھوں نے سلطانوں سے کوئی جاگیر حاصل نہ کی اور نہ ہی با اثر لوگوں سے رعایتیں اور فوائد حاصل کرنے کی کوشش کی ۔

شیخ کی شخصیت کی غالباً سب سے اہم خصوصیت اُن کا بے پایاں خلوص ہے ۔ اُن کی نجی زندگی اور عوامی زندگی میں کوئی تضاد نہیں تھا اور نہ ہی اُن کے قول و فعل میں کوئی فرق تھا ۔ شیخ بڑے رحم دل انسان تھے ۔ نوع انسان کی تکالیف پر اُن کی آنکھیں اشک آلود ہو جاتی تھیں ۔ اُن کا سلسلۂ تصوف نہ تو مقامی نوعیت کا تھا اور نہ ہی اُس کا حلقہ محدود تھا ۔ تصوف کے تمام سلاسل کے اولیاء اُن کے نزدیک قابل احترام تھے ۔ حقیقت یہ ہے کہ شیخ فرید شیخ شہاب الدین سہروردی کی تصنیف ''عوارف المعارف'' کے بڑے شائق تھے ۔ کہا جاتا ہے کہ شیخ شہاب الدین سہروردی سے اُن کی بغداد میں ملاقات ہوئی تھی اور شیخ شہاب الدین نے اُن کا بڑا احترام کیا تھا ۔ شیخ نے اپنے ایک فرزند کا نام بھی شیخ سہروردی کے نام پر شہاب الدین رکھا ۔ اس صاحب زادے کی ولادت کی خبر شیخ کو اُس وقت ملی تھی جب وہ ''عوارف المعارف'' پر اظہار خیال کر رہے تھے ۔ طریقت کے دوسرے سلسلوں کے ہم عصر رہنماؤں

خصوصاً اپنے پیارے دوست اور عزیز شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی سے بڑے خوش گوار تعلقات تھے ۔ حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی برصغیر میں سلسلۂ سہروردیہ کے سربراہ تھے ۔

شیخ فرید غیر مسلموں خصوصاً ہندوؤں سے بڑی خوش خلقی اور تواضع سے پیش آتے تھے اور یہ لوگ بھی شیخ کے اس وصف پر فریفتہ تھے ۔ شیخ کی وجدانی قوتیں اتنی عظیم تھیں کہ ان پر ہر شخص کی خامیاں ظاہر ہو جاتی تھیں لیکن وہ کسی بھی موقع پر عیبی لوگوں کو شرمندہ نہیں کرتے تھے اور نہ ہی کسی پر تعزیر عاید کرتے تھے ۔ ان کی ہمیشہ یہ کوشش ہوتی تھی کہ دانش مندانہ نصائح اور اچھی مثال سے لوگوں کے نقائص دور کیے جائیں اور انہیں اچھائی کی تعلیم دی جائے ۔

شیخ اگرچہ زاہد مرتاض تھے لیکن طبیعت میں خشکی نام کو نہیں تھی ۔ وہ اپنے اچھے اور لطیف مزاح سے افسردہ و دل شکستہ لوگوں کو مسرور کر دیتے تھے ۔ شیخ اپنی خوش گوار مسکراہٹ ، میٹھی اور رسیلی زبان ، گونج دار آواز اور چہرے کے پرکشش اور تابندہ تاثرات کے باعث بڑے ہر دلعزیز تھے ۔ اس کے ساتھ ہی اگر وہ کوئی نکتہ اپنے کسی مرید کو سمجھانا ضروری خیال کرتے تھے تو اسے بڑے ٹھوس انداز میں سمجھاتے تھے ۔ مثال کے طور پر ایک بار شیخ نظام الدین اولیاء نے نمک ادھار خریدا لیکن جب

خوراک میں وہ استعمال کیا گیا شیخ فرید نے اسے چکھنے سے انکار کر دیا - اس میں اہم نکتہ یہ تھا کہ شیخ کے اس پیارے مرید کی یہ عادت تھی کہ وہ ادھار لے کر رقم فقراء پر خرچ کر دیا کرتے تھے چنانچہ شیخ فرید نے اُن کی یہ عادت چھڑانے کے لیے یہ شدید طریقہ اختیار کیا -

گنج شکر

شیخ کو گنج شکر یعنی مٹھاس کا خزانہ کہا جاتا ہے - انھیں یہ لقب صرف اس لیے نہیں ملا تھا کہ ایک بار انھوں نے اپنی معجزاتی قوتوں سے کام لیتے ہوئے مٹی کو شکر میں تبدیل کر دیا تھا ، بلکہ اس لیے کہ اُن کا مزاج بڑا میٹھا تھا - اس مزاج کے باوجود دلوں میں اُن کی شخصیت کے اجلال و احترام کا احساس بھی جاگ اٹھتا تھا - سو اُن کی شخصیت ایک مکمل شخصیت تھی - اُن کی روح آزاد تھی اور وہ جلال و جمال کا ایک نہایت حسین مرقع تھے -

عظیم ماہر نفسیات

اب ہم نیچے شیخ کے منتخب مقولوں کا آزاد ترجمہ پیش کرتے ہیں - یہ مقولے پروفیسر کے - اے - نظامی نے امیر خورد کی تصنیف سے نقل کیے ہیں - ان مقولوں سے

ظاہر ہوتا ہے کہ شیخ ایک اعلیٰ پائے کے نفسیات دان تھے اور آپ کی نگاہ اتنی عمیق اور غائر تھی کہ انہیں انسانی فطرت کا مکمل ادراک تھا۔ انہوں نے جو بھی تعلیم دی ہے وہ عظیم اور عملی ہے :

١ ۔ جسم کی خواہشات کو پورا نہ کرو کیونکہ جتنا انہیں پورا کیا جائے گا اتنا ہی یہ بڑھتی جائیں گی ۔

٢ ۔ وہ شے بیچنے کی کوشش نہ کرو جسے لوگ خریدنے کی خواہش نہ کریں ۔

٣ ۔ کسی کی روٹی نہ کھاؤ بلکہ اپنی روٹی بھی دوسروں کو دے دو ۔

٤ ۔ اپنے گناہوں پر ڈینگیں نہ مارو ۔

٥ ۔ اپنے دل کو شیطان کا کھلونا نہ بناؤ ۔

٦ ۔ اپنے باطن کو ظاہر سے بہتر بناؤ ۔

٧ ۔ اونچا درجہ حاصل کرنے کی کوشش میں خود کو نہ جھکاؤ ۔

٨ ۔ کمزور اور طاقت ور دونوں سے کوئی شے ادھار نہ لو۔

٩ ۔ قدیم خاندانوں کا احترام کرو ۔

١٠۔ ہر روز نئے روحانی جوہر کی آرزو کرو ۔

١١۔ اچھی صحت کو خدائے عز و جل کا کرم سمجھو ۔

۱۲- دوسروں سے اچھائی کرتے ہوئے یہ سوچو کہ تم اپنی ذات سے اچھائی کر رہے ہو -

۱۳- اس چیز کی لگن کو فوراً چھوڑ دو جسے تمھارا دل برا سمجھے -

۱۴- اچھائی کرنے کے لیے ہمیشہ کسی بہانے کی تلاش میں رہو -

۱۵- کسی سے اس طرح لڑائی جھگڑا نہ کرو کہ مصالحت کی گنجائش ہی نہ رہے -

۱۶- دشمن کتنا ہی رام کیوں نہ ہو جائے خود کو اس سے محفوظ نہ سمجھو -

۱۷- جو تم سے خوف کھائے تم اس سے خوف کھاؤ -

۱۸- جنسی خواہشات دبانے کے لیے ہر وقت ضبط نفس بہت ضروری ہوتا ہے -

۱۹- امراء کی صحبت میں مذہب کو نہ بھولو -

۲۰- وقت کے برابر کوئی شے قیمتی نہیں -

۲۱- مغرور اور متکبر لوگوں سے سابقہ پڑے تو تمکنت ضروری ہو جاتی ہے -

۲۲- مہمانوں کی خدمت کے لیے اسراف بیجا نہ کرو -

زہد و ترکِ دنیا

زہد اور ترک دنیا شیخ کی فطرتِ ثانیہ بن چکا تھا اور انھوں نے یہ کبھی نہیں سوچا تھا کہ اب اسے ختم کر دینا چاہیے۔ ایک بار ایک مرید نے انھیں نئی قمیض پیش کی جسے انھوں نے نہایت شفقت سے قبول کر لیا، لیکن قمیض زیب تن کرتے ہی انھیں تحریک ہوئی اور انھوں نے قمیض اتار کر شیخ نجیب الدین متوکل کو دے دی۔ ساتھ ہی یہ کہا کہ یہ قمیض پہن کر مجھے وہ روحانی انبساط نہیں ہؤا جو اپنی بوسیدہ و دریدہ قمیض پہن کر ہوتا ہے۔ شیخ نے اپنی زندگی کے معتدبہ حصے میں مسلسل روزے رکھے۔ کئی بار انتہائی غربت کے باعث انھیں متواتر کئی کئی روز تک بغیر خوراک کے رہنا پڑتا تھا۔ شیخ کے تبرکات میں، جو پاکپتن کی خانقاہ میں محفوظ ہیں، لکڑی کے چھوٹے چھوٹے گول ٹکڑے بھی ہیں جنھیں بابا فرید کی لکڑی کی روٹیاں کہا جاتا ہے۔ شیخ بھوک لگنے پر ان لکڑی کی روٹیوں کو دانتوں سے کاٹ کر نفس کو مطمئن کرنے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ جب اُن کے مادی حالات قدرے بہتر ہو گئے، اُن کی خانقاہ کو مرکزی حیثیت حاصل ہوگئی اور خاصی فتوح خانقاہ میں پہنچنے لگی تو پھر بھی شیخ نے مسلسل روزے رکھنے کی عادت ترک نہ کی۔ اُن کی روزانہ خوراک عموماً صبح کے وقت شربت کے چند جرعوں اور شام کو روٹی کے چند لقموں

پر مشتمل ہوتی تھی ۔ کچھ روایتوں کے مطابق وہ سال سال بھر مسلسل روزے رکھا کرتے تھے، اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ شام کو صرف چند گھونٹ پانی پیا کرتے ہوں گے ۔ ان سال سال بھر کے روزوں میں صرف وہ چند ایام خالی جاتے تھے جن ایام میں روزہ رکھنے کی ممانعت ہے ۔ آن کی ذاتی اشیاء نہایت قلیل تھیں ۔ ان میں ایک پرانا کمبل بھی تھا جس کی لمبائی بہت کم تھی ۔ آرام کے وقت شیخ اسے نیچے بچھا کر لیٹ جاتے تھے اور تکیے کا کام اپنے عصا سے لیتے تھے ۔ یہ عصا انھیں مرشد سے ملا تھا چنانچہ شیخ فرید اکثر اوقات اسے بوسہ دیا کرتے تھے ۔ شیخ کے اہل خاندان نے بھی ان مصائب میں شیخ کا ساتھ دیا ، یہاں تک کہ ایک مرتبہ بھوک کی شدت سے شیخ کا ایک بچہ غش کھا گیا اور اس امر کا خدشہ ہوگیا کہ بچہ جاں بحق ہو جائے گا ۔ شیخ کو جب اس واقع کی اطلاع ملی تو وہ بالکل مضطرب نہ ہوئے اور کچھ کرنے سے اپنی معذوری کا اظہار کیا ، تاہم خدا کا فضل و کرم ہمیشہ شامل حال رہتا تھا لٰہذا شیخ کے خاندان میں ایسا کوئی المیہ رونما نہ ہوتا تھا ۔ ایسی حکایات سے کسی کو یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ شیخ معاذ اللہ بے حس اور انسانی مصائب کے بارے میں سنگ دل تھے ۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ بڑے نرم دل انسان تھے اور بچوں کے خصوصاً بڑے شائق تھے ۔ وہ بچوں سے بڑے پیار اور

محبت سے پیش آتے تھے ۔

رحم دلی

ایک مرتبہ شیخ نے آنے والے چند لوگوں کی تواضع کے لیے خود آٹا پیسا اور روٹیاں پکا کر اُن کے سامنے رکھیں۔ ایک بار کچھ فقراء خانقاہ میں آئے ۔ جب انھوں نے چلنے کی تیاری کی تو شیخ نے انھیں روکنے کی متعدد بار کوشش کی اور کہا کہ وہ ان کے پاس قیام کریں مگر فقراء نے کہ ضدی اور خود رائے تھے ایک نہ سنی ۔ بالآخر شیخ نے اُن سے التماس کی کہ وہ سفر کے دوران صحرا میں گھسنے سے اجتناب کریں مگر فقراء بگڑ گئے اور تاؤ کھا کر خانقاہ سے چل دیے انھوں نے شیخ کی التجاؤں پر کان نہ دھرا ۔ ان کے جانے کے بعد شیخ نے اُن کے نقصان پر بڑا افسوس کیا ۔ وہ کسی پریشان حال بچے کی طرح آنسو بہا رہے تھے ۔ بعد میں پتہ چلا کہ تمام فقراء صحرا میں بھٹک کر ہلاک ہو چکے ہیں ۔ اس قصے سے شیخ کی رحم دلی پر روشنی پڑتی ہے کیونکہ انھیں اپنی وجدانی قوتوں سے فقراء کے انجام کا پتا چل گیا تھا ۔

وقار

جیسے کہ ہم پہلے مشاہدہ کر چکے ہیں شیخ بادشاہوں

سے تعلقات قائم کرنے سے اجتناب کرتے تھے اور اُن کی طرف سے کسی اراضی کا عطیہ قبول نہیں کرتے تھے یہی وجہ ہے کہ حق کی حمایت کرنے میں اُن کی پوزیشن بڑی منفرد ہوتی تھی - اُن کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ حکمرانوں کے نزدیک بڑے وزنی ہوتے تھے - ایک مرتبہ انھوں نے ان الفاظ میں سلطان سے ایک شخص کی سفارش کی :

"میں اس شخص کا معاملہ پہلے اللہ اور پھر آپ کے سپرد کرتا ہوں - اگر آپ اسے کچھ دیں گے تو حقیقت میں دینے والا خدا ہی ہوگا لیکن آپ اس عمل سے ثواب حاصل کریں گے اور سائل آپ کا احسان مند ہوگا ، تاہم اسے کچھ نہ دے سکے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ خدا اس شخص کو کچھ دینے کی راہ میں حائل ہے ، پس آپ ہر قسم کے الزام سے مبرا ہوں گے -"

بادشاہ کے نام شیخ کے مکتوب کے یہ الفاظ شیخ کا وقار ظاہر کرتے ہیں - درحقیقت شیخ کا وقار خدائی جاہ وجلال کا ایک پرتو تھا - ان الفاظ سے یہ پتا بھی چلتا ہے کہ شیخ خدائے عزوجل کو ہی صحیح قوت عاملہ سمجھتے تھے اور اسی لیے انھیں ہمیشہ اپنے خدا پر بھروسہ ہوتا تھا -

کامل استاد

ایک اور موقع پر ایک حاکم ایک عہدے دار سے ناراض ہو گیا ۔ شیخ نے مورد عتاب عہدے دار کے حق میں حاکم سے اچھے الفاظ میں سفارش کی مگر حاکم پر کوئی اثر نہ ہؤا ، تاہم شیخ کو اس رحم کے طالب عہدے دار کو نصیحت کرنے کا موقع ہاتھ آ گیا ۔ انھوں نے عہدےدار سے کہا :

> ''معلوم ہوتا ہے کہ تم خود بھی سخت دل ہو اور جو لوگ تم سے رحم کی التجا کرتے ہیں ناکام رہتے ہیں ، یعنی تم بھی لوگوں پر رحم کر سکتے تھے لیکن نہیں کرتے تھے ۔''

اسی اثنا میں حاکم بھی خانقاہ میں حاضر ہؤا ۔ اُس نے شیخ کے الفاظ سنے تو اُس کا دل پسیج گیا اور اُس نے شیخ کے سامنے اپنے انفعال کا اظہار کرتے ہوئے معتوب عہدے دار کو معاف کر دیا اور شیخ کی خواہشات کے مطابق عمل کرنے کا عہد کیا ۔ شیخ نے دونوں کے حق میں دعا کی اور دونوں نے وعدہ کیا کہ آئندہ وہ ہمیشہ راہِ راست پر چلیں گے ۔ براہِ راست نصیحت کرنے کا یہی وہ عجیب وغریب طریقہ ہے جس پر شیخ عمل کیا کرتے تھے ۔

شیخ سماع کے بڑے دل دادہ تھے ۔ ایک مرتبہ اُن کی

موجودگی میں سماع کے جواز و عدم جواز کی بحث چھڑ گئی جب یہ بحث حد سے بڑھ گئی تو شیخ نے فرمایا :

''بڑائی تو صرف اللہ کی ذات کے لیے ہے - کوئی تو عشق الٰہی کی آگ میں جل کر فنا ہو گیا ہے اور دوسرے جواز و عدم جواز کی بحث میں الجھے ہوئے ہیں -''

قاضی حمید الدین ناگوری کے پوتے شیخ شرف الدین کے دل میں شیخ فریدؒ کی کشش پیدا ہوئی چنانچہ انہوں نے اجودھن پہنچ کر شیخؒ کے سلسلۂ تصوف میں شریک ہونے کا فیصلہ کیا - جب اُن کی کنیز کو اس بات کا علم ہوا تو اُس نے اپنے آقا کو ایک دستار دی کہ یہ میری طرف سے شیخ فریدؒ کو پیش کر دی جائے - شیخؒ نے شیخ شرف الدینؒ کو طریقت میں شامل کیا اور کنیز کی بھیجی ہوئی دستار بھی قبول کر لی - اس کے ساتھ ہی اُن کی زبان سے یہ الفاظ نکلے : ''خدا اس کنیز کو آزاد کرے -'' شیخ شرف الدینؒ کو یقین ہو گیا کہ شیخؒ کی دعا سے کنیز واقعی آزادی حاصل کر لے گی لیکن کنیز چونکہ بڑی قیمتی تھی اس لیے شیخ شرف الدین اُسے آزاد کرنے میں متامل ہوئے - انہوں نے سوچا کیوں نہ اس کنیز کو فروخت کر دیا جائے تاکہ اُس کا دوسرا آقا اسے آزاد کرے اور مجھے کوئی نقصان نہ اٹھانا پڑے - لیکن اس کے ساتھ ہی اُن کے ذہن میں

خیالات کی آویزش شروع ہو گئی کہ کنیز کو آگے فروخت کرنے میں کیا عقل مندی ہوگی ۔ کیوں نہ میں ہی کنیز کو آزاد کر کے شیخؒ کی دعا کا ثواب حاصل کروں ۔ چنانچہ انھوں نے فیصلہ کیا کہ طریقت میں شامل ہونے کے بعد اسی نیک کام سے زندگی کا آغاز کیا جائے ۔ وہ شیخؒ کے پاس پہنچے اور انھیں بتایا کہ میں نے کنیز کو آزاد کر دیا ہے ۔ اس میں قابلِ غور نکتہ یہ ہے کہ شیخؒ نے اپنے اس نئے مرید کو یہ حکم نہیں دیا تھا کہ کنیز کو آزاد کر دیا جائے ، صرف اس کی آزادی کی دعا مانگ کر اپنی خواہش ظاہر کر دی اور باقی کا کام اپنے مرید کی اعلیٰ اقدار پر چھوڑ دیا ۔

زہد کا پھل

شیخؒ کے متعلق لکھی جانے والی کتاب ''راحت القلوب'' سے ہمیں پتا چلتا ہے کہ شیخؒ نے مسلسل بیس برس تک کھڑے ہو کر مراقبہ کیا اور خدا کے عجائب و غرائب پر غور و فکر کیا ، حتیٰ کہ ان کے پاؤں سوج جاتے تھے اور اکثر اوقات ان سے خون بہنے لگتا تھا ۔ شیخؒ اپنے چلۂ معکوس کی وجہ سے بھی بڑے مشہور ہیں ، یعنی شیخ نے ایک کنوئیں کی منڈیر پر اگے ہوئے درخت سے رسّا باندھا اور اپنے پاؤں اس رسے سے باندھ کر اور کنوئیں میں الٹا

لٹک کر چالیس روز تک ریاضت کی ۔ اسی قسم کا ایک چلہ انھوں نے اوچ شریف کی مسجدِ حاجات میں کیا ۔ ان کا ایک ہم راز تھا جس نے اس چلّے میں اُن کی مدد کی اور کسی کو اس کا علم نہ ہو سکا ۔

اپنی زندگی کے آخری ایام میں شیخؒ اکثر یہ کہا کرتے :

''چالیس برس تک خدا کے بندے مسعود نے اپنے آقا کی اطاعت کی ۔ اب گزشتہ چند برس سے یہ حالت ہے کہ آقا کی ذرہ نوازی سے مسعود کے فکر و خیال میں جو کچھ آیا وہ حقیقت ثابت ہؤا اور مسعود نے جو بھی آرزو کی باریاب ہوئی ۔''

شیخؒ کی روزمرہ کی زندگی

شیخؒ کا معمول تھا کہ وہ اپنی خانقاہ آنے والوں کی سہولت کے لیے آدھی رات تک کھلی رکھتے تھے ۔ رات کا زیادہ حصہ عبادت میں گزارتے تھے اور سورج طلوع ہونے کے بعد بھی عبادت اور مراقبے میں مصروف رہتے تھے ۔ طہارت و صفائی اُن کی فطرتِ ثانیہ تھی ۔ روزانہ غسل کرنا اُن کی عادت تھی ۔ ہر روز صبح وہ عبادت کے بعد دو گھنٹے تک طویل سجدہ کرتے تھے اور اس دوران میں کبھی خاموشی سے دعا مانگتے تھے ، کبھی اپنے خالق کی حمد و ثنا میں اشعار پڑھتے تھے

اور کبھی تمام مخلوق کی بخشش کی دعائیں مانگتے ہوئے بے حد گریہ و زاری کرتے تھے ۔ اس کے بعد وہ دوپہر تک آنے والوں سے ملاقات کرتے تھے ۔ پھر تھوڑی دیر کے قیلولے کے بعد نماز پڑھتے تھے اور خانقاہ کے مکینوں کی ضروریات پوری کرنے پر توجہ دیتے تھے ۔ پس اس طرح وہ خدا کی عبادت کے ساتھ ساتھ نوع بشر کی خدمت بھی کرتے تھے ۔ ہر آنے والا آن تک رسائی حاصل کر سکتا تھا ۔ بعدہ شیخؒ آدھی رات تک دیگر متفرق کاموں میں مشغول رہتے تھے ۔

بحرِ دانش

شیخؒ ایک ایسے سمندر کی مانند تھے جس میں بہت کچھ ہوتا ہے اور ہر شخص اپنی ضرورت اور حد تک آن سے بہرہ ور ہوتا تھا ۔ شیخؒ نے کوئی تصنیفات نہیں چھوڑیں تاہم آن کے مقولوں کے مجموعے موجود ہیں ۔ انھیں شیخؒ ابو الحسنؒ الشاذلیؒ سے مماثل قرار دیا جا سکتا ہے ۔ شیخؒ ابو الحسنؒ سے ایک مرتبہ کسی نے پوچھا کہ یا شیخؒ ! آپ نے کون سی کتاب لکھی ہے تو شیخ ابو الحسنؒ نے اپنے مریدوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا تھا کہ میرے یہ مرید میری کتابیں ہیں ۔ شیخ فریدؒ نے بھی اپنے بعد بڑے ممتاز مرید چھوڑے ۔ شیخؒ نے بڑی محبت سے

اپنے ان مریدوں کی نگہداشت کی ۔ انھیں طریقت کی راہ پر قدم بہ قدم گام زن کیا ۔ کارآمد مشوروں اور مناسب حوصلہ افزائی سے اُن کا بوجھ ہلکا کیا ۔ انھیں برائیوں سے پاک کیا اور اُن کی شخصیتوں کو بہترین صفات سے آراستہ کیا ۔ چنانچہ اس طرح وہ عوام الناس کے رہنما بننے کے قابل ہو سکے اور انھوں نے بے شمار لوگوں کو تقدس اور نجات کی راہ دکھائی ۔ شیخ ؒ کے مقولے دانش و حکمت سے پُر ہیں ۔ مثال کے طور پر درویش کی یوں تعریف کی ہے :

''ایک درویش میں چار خصوصیات کا ہونا ضروری ہے : وہ نابینا ہو ، بہرا ہو ، گونگا ہو اور لنگڑا ہو ، یعنی اُسے دوسروں کی خامیوں کی طرف سے اپنی آنکھیں بند کر لینی چاہییں ۔ بری باتیں سننے کے مقابلے میں بہرا ہو جانا چاہیے ۔ اُسے اپنی زبان پر بری باتیں نہیں لانی چاہییں اور اپنے پاؤں سے کسی ایسے مقام پر نہیں جانا چاہیے جو خدا کے نزدیک قابلِ نفرت ہو ۔''

شیخ فرید کے نزدیک ایک درویش کے دل میں اگر ذرہ برابر بھی دنیا کی محبت موجود ہے تو اس کا درویشی کا دعوی کذب و افترا پر مبنی ہے ۔ ایک درویش کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ کسی کو بد دعا دے چاہے اس کے سر پر ننگی تلوار چمک رہی ہو اور موت بالکل قریب آ گئی

ہو ۔ اس کے بجائے درویش کے لیے ضروری ہے کہ وہ دشمن کی بھی بھلائی چاہے اور اس سے جلد از جلد مصالحت کرے ۔ ایک مرتبہ شیخ نے فرمایا :

”صرف وہی دل دانش کا گھر بن سکتا ہے جو تلون ، وسواس ، رشک و حسد اور حرص و طمع سے پاک ہو ۔“

ایک مرتبہ انھوں نے فرمایا :

”میں نے چار چیزوں کے بارے میں سات سو شیوخ سے تبادلۂ خیال کیا ہے اور ان سب نے ان چار چیزوں کے بارے میں اتفاقِ رائے کا اظہار کیا ہے :

۱۔ صرف وہی شخص سب سے زیادہ دانا ہے جو دنیا سے قطع تعلق کر لیتا ہے ۔

۲۔ صرف وہی شخص سب سے زیادہ مقدس ہے جس کا عزم محکم ہو اور جسے کوئی تبدیل نہ کر سکے ۔

۳۔ صرف وہی شخص سب سے زیادہ دولت مند ہے جو مطمئن اور قانع ہے ۔

۴۔ صرف وہی شخص سب سے زیادہ ضرورت مند ہے جس میں قناعت کا فقدان ہے ۔

ایک اور موقع پر شیخ نے صوفی کی تعریف یوں کی کہ صوفی وہ ہوتا ہے جو ہر شے کو پاک کرے اور اسے کوئی شے ناپاک و نجس نہ کر سکے ۔ ایک بار شیخؒ کو کسی نے قینچی کا تحفہ دیا لیکن انھوں نے لینے سے انکار کرتے ہوئے کہا : ''مجھے اس کی جگہ سوئی دو کیونکہ میں دلوں کو جوڑنے کے لیے آیا ہوں انھیں توڑنے اور پارہ پارہ کرنے کے لیے نہیں ۔'' شیخؒ اپنے پیروکاروں کو ہمیشہ یہی نصیحت کرتے تھے کہ وہ برائی کا جواب اچھائی سے دیں ۔ اجودھن کے قاضی نے ایک مرتبہ شیخ کو مسلسل کئی برس تک عقوبت کا نشانہ بنائے رکھا لیکن انھوں نے مثالی صبر و تحمل سے تمام تکالیف برداشت کیں ۔ ایک مرتبہ ایک شخص نے ان پر قاتلانہ حملہ کیا لیکن شیخ نے اسے معاف کر دیا ۔ وہ اپنے مریدوں کو بھی یہ کہا کرتے تھے کہ اگر کوئی تمھاری توہین کرے تو اسے معاف کر دو ۔

زہد کے نزدیک شریعت کی تعریف

شیخؒ قوانینِ شریعت کی پابندی کا بڑا اہتمام کرتے تھے ۔ وہ اسلام کے تمام ارکان پر بڑا زور دیتے تھے ۔ انھوں نے ذاتی مثال سے مریدوں کو تعلیم دی کہ وہ عبادات کو بغیر کسی حیل و حجت کے بجا لایا کریں ۔ کہا جاتا ہے کہ

شیخؒ نے ایک سے زیادہ مرتبہ حج بیت اللہ کیا ۔ وہ ہمیشہ عبادات اسلامی کے باطنی معانی پر زور دیا کرتے تھے اور اگر وہ یہ سمجھتے تھے کہ مریدوں کے لیے کسی مسئلے میں کمال حاصل کرنا ضروری ہے تو وہ انھیں اس مسئلے سے دور نہیں ہٹنے دیتے تھے ۔ ایک مرتبہ وہ زکواۃ کی اہمیت پر خطبہ دے رہے تھے ۔ زکواۃ کی وضاحت کرتے ہوئے انھوں نے فرمایا :

"زکواۃ کی تین قسمیں ہیں : شریعت کی زکواۃ ، طریقت کی زکواۃ اور حقیقت کی زکواۃ ۔ شریعت کی زکواۃ یہ ہے کہ دو سو درہموں پر پانچ درہم خدا کی راہ میں دے دیے جائیں ۔ طریقت کی زکواۃ یہ ہے کہ دو سو درہموں پر فقیر پانچ درہم اپنے لیے رکھے اور باقی خدا کی راہ میں دے دے ۔ اور حقیقت کی زکواۃ یہ ہے کہ دو سو کے دو سو درہم خدا کی راہ میں خرچ کر دیے جائیں کیونکہ درویش ہونے کا مطلب ہی یہ ہے کہ درویش اپنے آپ کو خدا کی ذات میں فنا کر دے اور اپنے پاس کچھ نہ رکھے ۔"

اسلام کا چھٹا رکن

اجودھن کا ایک ملا عادتاً اہل تصوف کے طور طریقوں

کی مذمت کرتا تھا جس سے شیخ کے مریدوں کو ایذا پہنچتی تھی - ایک مرتبہ شیخ نے اُس سے پوچھا : ''اسلام کے ارکان کتنے ہیں ؟'' ملا نے جواب دیا : ''اسلام کے پانچ ارکان ہیں -'' شیخ نے فرمایا : ''اسلام کے چھ ارکان ہیں اور چھٹا رکن ہے ذریعۂ معاش -'' ملا کو اس پر بڑا تعجب ہوا تاہم اُس نے اس سے کوئی سروکار نہ رکھا اور شیخ اور اُن کے مریدوں کے خلاف عداوت پر کمربستہ رہا - چند روز بعد وہ ملا حج پر مکہ معظمہ روانہ ہوا - واپسی پر طوفان آ جانے سے جہاز تباہ ہو گیا لیکن ملا بال بال بچ گیا - سمندر کی موجوں نے اسے ایک ایسے ساحل پر لا پٹکا جو صحرا تھا - ملا کو ہوش آیا تو وہ صحرا میں خوراک اور پناہ کی تلاش میں مارا مارا پھرنے لگا - اچانک اُس کے سامنے ایک بزرگ ظاہر ہوا - ملا نے اُس کے سامنے دستِ سوال دراز کیا - بزرگ ملا کو خوراک مہیا کرنے پر رضامند ہو گیا لیکن شرط یہ عاید کی کہ وہ اس بات کو قبول کرے کہ اسلام کے چھ ارکان ہیں اور چھٹا رکن ذریعۂ معاش ہے - مزید برآں بزرگ نے اس بات پر بھی اصرار کیا کہ ملا خوراک کے عوض اپنی تمام نیکیاں اس کے نام لکھ دے - ملا نے خوراک حاصل کرنے کے لیے یہ تمام شرایط بڑی مستعدی سے مان لیں - شیخ نے ایک کاغذ پر ملا کے دستخطوں سے ایک تحریر حاصل کرنے کے بعد اسے خوراک دی اور

اس کی واپسی کے انتظامات بھی کیے - ملا بخیریت اجودھن پہنچ گیا اور کچھ عرصے بعد صحرا کی تمام واردات بھول کر پرانی عادت کے مطابق صوفیوں کو دق کرنا شروع کر دیا - ساتھ ہی اس نے یہ تنازعہ دوبارہ شروع کر دیا کہ ذریعۂ معاش اسلام کا چھٹا رکن نہیں ہے - شیخ نے ملا کو خانقاہ میں بلایا اور اس کی آنکھوں کے سامنے ایک کتاب کھول کر حاضرین کی نظروں سے بچا کر اسے ایک کاغذ دکھایا جو کتاب کے صفحات میں اڑسا ہوا تھا - اس کاغذ پر وہی تحریر تھی جو ملا نے اپنے دستخطوں سے صحرا میں بزرگ کو خوراک کے بدلے دی تھی - یہ کاغذ دیکھ کر ملا کو شدید اذیت ہوئی ، حتیٰ کہ اسے غش آ گیا - جب اسے ہوش آیا تو اس نے بڑے احترام اور خلوص سے شیخ کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہوئے اپنے گزشتہ رویے پر پشیمانی کا اظہار کیا - یہ حکایت خصوصاً ہمارے دور کے لیے بڑی مناسب ہے - اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شیخ عوام کے اس عقیدے کے مخالف تھے کہ درویش وہی ہوتا ہے جو کسبِ معاش نہ کرے اور کاہل الوجود بن کر صرف خیرات پر گزر اوقات کرے - یہی وجہ ہے کہ شیخ کے تمام مریدوں کے لیے جنگل میں جا کر کام کرنا اور مہمان خانے میں عوام کی خدمت کرنا ضروری ہوتا تھا ، حتیٰ کہ معذور اور بزرگ ترین (تقدس و زہد کے اعتبار سے) مریدوں کو بھی

یہی سبق ملتا تھا کہ وہ کسی نہ کسی قسم کی خدمت ضرور بجا لایا کریں ۔ یہ حکایت ظاہر کرتی ہے کہ حقیقت کی کئی سطحیں ہوتی ہیں اور زہد و ترکِ دنیا ہر ایک کے لیے نہیں ہے ۔ عوام کو بنیادی ضرورتیں مہیا کرنا اسلام میں بڑی اہمیت رکھتا ہے ، یعنی دین اور دنیا الگ الگ نہیں ہیں ۔

شیخ فرید کی شاعری

شیخ فرید کے مریدوں میں اگرچہ امراء بھی شامل تھے لیکن وہ خود حقیقتاً عوامی درویش تھے ۔ زہد، پاکیزگی اور محبت کے بارے میں ان کا پیغام عوام ہی کے نام تھا ۔ ان کی شاعری بھی عوام کو تعلیم دینے کا ایک ذریعہ تھا ۔ ہمارے دیہات میں بے شمار افراد ایسے ملتے ہیں جو ناخواندہ ہوتے ہیں لیکن انھیں شیخ کے دوہے زبانی یاد ہوتے ہیں ۔ ان دوہوں میں ان کی تعلیمات ابھی تک محفوظ ہیں ۔ اے ۔ سی ۔ وولنر کے نزدیک ان دوہوں میں پنجابی شاعری کی تمام خصوصیات موجود ہیں ۔ وہ کہتے ہیں :

"پنجابی شاعری کا اپنا سحر ہے ۔ اس کی زبان اردو اور ہندی سے قدیم ہے ۔ اس کے تمام تر نقوش دیہاتی زندگی اور دیہاتیوں کے سادہ پن سے لیے گئے ہیں ۔ پنجابی شاعری کو جنوبی فرانس کی پرووونسل شاعری سے مماثل قرار دیا جا سکتا ہے کیونکہ پرووونسل زبان بھی فرانسیسی زبان سے قدیم ہے ۔ پنجابی شاعری کا تعلق دیہات ، کھیتوں اور ایسے چھوٹے قصبات سے ہے جن میں منڈیاں لگتی ہیں ۔ پنجابی شاعری کی جبلت میں

وہی سادگی اور خلوص ہے جو کسی قدیم تر
زبان کا تحفہ ہوتا ہے - پنجابی شاعری زیادہ تر
محبت اور خدا کے نغمے الاپتی ہے - کئی مصنفین
اس بات کی تائید کرتے ہیں کہ سکھوں کی مقدس
کتاب گرنتھ صاحب کے اکثر شلوک شیخ فرید کے
لکھے ہوئے ہیں - کچھ دانش وروں کے نزدیک
ان شلوکوں کے مصنف شیخ ابراہیم فرید ثانی ہیں
جو شیخ فریدالدین گنج شکرؒ کی اولاد میں
سے تھے -''

اس مسئلے پر ڈاکٹر لاجونتی راما کرشنا نے بھی اپنی
کتاب ''پنجابی صوفی شاعر'' میں بحث کی ہے - وہ لکھتی ہیں :

''جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا فرید ثانی شیخ
ابراہیم کا لقب ہے جو انہیں ان کے تقدس کی
بنا پر عوام سے ملا تھا اور انھوں نے اس لقب
کو تخلص کی حیثیت سے استعمال کیا - پس یہ ایک
عام عقیدہ ہے کہ آدی گرنتھ میں جو اشعار فرید
کے نام سے ہیں وہ فرید اول کے لکھے ہوئے ہیں -
میکلف کو یقین ہے کہ گرنتھ میں جو شلوک
فرید کے نام سے موجود ہیں وہ شیخ براہم کے
لکھے ہوئے ہیں لیکن بابا بدھ سنگھ کی رائے یہ
ہے کہ یہ شلوک ملے جلے ہیں اور فرید اول اور

فرید ثانی کے لکھے ہوئے ہیں - میکالف کی یہ دلیل کہ فرید اول گورو نانک کے عہد میں بقید حیات نہیں تھے اور گورو کی شیخ ابراہیم سے ملاقات ہوئی تھی اس لیے گرنتھ کے شلوک شیخ ابراہیم کے ہیں اتنی مضبوط اور منطقی نہیں - گرنتھ میں ایسے ولیوں کی مناجاتیں بھی شامل ہیں جو گورو نانک سے بہت پہلے گزرے ہیں اور ایسے درویشوں کے اشعار بھی ہیں جن سے گورو نانک کی کبھی ملاقات نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی گورو کے ان سے ذاتی تعلقات تھے - بابا بدھ سنگھ دو حقایق کو اپنی دلیل کی بنیاد بناتے ہیں - وہ یہ کہ امیر خسرو ، جو باہر سے ہند آئے تھے ، بڑی اچھی طرح ہندی میں لکھ سکتے تھے تو پھر فریدالدین، جن کی پرورش ہی پنجاب میں ہوئی تھی ، پنجابی میں کیوں نہیں لکھ سکتے - کچھ شلوک مثلاً :

فریدا روٹی میری کاٹھ دی لاون میری بھکھ
جنہاں کھادیاں چوپڑیاں سو ای سہن گے دکھ

(اے فرید میری روٹی لکڑی کی ہے جو میری بھوک مٹاتی ہے لیکن جنھوں نے چپڑی ہوئی کھائی ہیں وہ دکھ سہیں گے)

صاف طور پر ان واقعات کی طرف اشارہ کرتے ہیں
جو فرید اول کی زندگی میں رونما ہوئے ، چنانچہ اس
قسم کے شلوک یقیناً انھی کے ہیں - بابا بدھ سنگھ
کے نزدیک فرید کے نام سے لکھے ہوئے شلوکوں
کے شیخ فرید اور شیخ ابراہیم مشترکہ مصنف ہیں -
ان دو دلایل میں سے پہلی دلیل اتنی مؤثر نہیں
ہے - رہی دوسری تو اسے اس حقیقت کی بنا پر
بے نتیجہ قرار دیا جا سکتا ہے کہ شیخ فریدالدین
گنج شکرؒ کی زندگی میں جو واقعات رونما ہوئے
تھے وہ ان کی اولاد اور جانشینوں نے نظم
کیے تھے -''

اگرچہ میکلف کی دلیل بھی اسی طرح کمزور ہے تاہم
اس سے ہم اتفاق کرتے ہیں کیونکہ اس نے جو نتیجہ نکالا
ہے اسے شیخ فرید کے ایک شلوک کی تائید حاصل ہے -
یہ شلوک ، جو گرنتھ میں موجود ہے ، یہ ہے :

شیخ حیاتی جگ نا کوئی تھرن رہیا
جسو آسن ہم بیٹھا کیتی باس گیا

(یعنی اے شیخ دنیاوی زندگی دائم نہیں ہے - جس
نشست پر میں بیٹھا ہوں اس پر کئی اور بھی بیٹھ
چکے ہیں)

مذکورہ بالا شلوک سے ہم یہ سمجھ سکتے ہیں کہ اس کے خالق فرید الدین نہیں تھے بلکہ ان کی اولاد میں سے کوئی تھے جنھیں شیخ کی روحانی گدی ملی تھی اور ظاہر ہے کہ وہ فرید ثانی ہی تھے۔ یہ نتیجہ بھی پوری طرح قابلِ قبول نہیں ہے۔ شیخ فرید الدین گنج شکرؒ کو قدرت کی طرف سے حساس اور فنکارانہ مزاج عطا ہؤا تھا۔ انھوں نے عمیق اور دین دارانہ لطافت و شائستگی ورثے میں پائی تھی اور اپنے روحانی آبا و اجداد سے احساس کی دولت بھی حاصل کی تھی۔ ان کے سینے میں ایک ایسا دل دھڑکتا تھا جس میں خدا کا خوف تھا، خدا کی محبت تھی اور خدا کا ادراک تھا۔ لاریب وہ فارسی کی صوفیانہ شاعری کی قیمتی میراث کے وارث تھے، چنانچہ اس میراث کو وہ وقتاً فوقتاً اپنے فاضل مریدوں کے سامنے کسی اعتقادی نکتے کو واضح کرنے کے لیے استعمال کرتے تھے اور دنیا دار لوگوں کو سمجھانے کے لیے وہ عموماً اپنی مادری زبان استعمال کرتے تھے جو مقامی بولی بھی تھی۔ ان کے اس عمل کا مقصد یہ تھا کہ عوام ان کی بات سمجھ سکیں، چنانچہ اس دستورالعمل پر کسی حیرت کا اظہار نہیں کرنا چاہیے۔

پروفیسر اے۔ کے۔ نظامی نے اپنی تصنیف ''شیخ فریدالدین گنج شکرؒ کی زندگی اور دور'' میں امیر خورد کے حوالے سے شیخ کی کئی فارسی اور عربی نظموں کے منتخب

اشعار نقل کیے ہیں۔ انھوں نے ڈاکٹر مولوی عبدالحق کی کتاب ''زبان اردو کی ابتدائی ترقی میں صوفیاء کی کارکردگی'' کا بھی حوالہ دیا ہے اور نمونے کے طور پر بابا فرید کے اردو اشعار بھی نقل کیے ہیں ، لیکن اس کے ساتھ ڈاکٹر نظامی لکھتے ہیں کہ فاضل مصنف نے ان ذرایع کا انتقادی جائزہ نہیں لیا جن کی وساطت سے انھوں نے یہ اشعار جمع کیے ہیں۔ تاہم ان کی صداقت اس حقیقت کی بنا پر مشکوک ہو جاتی ہے کہ ان اشعار میں جو تخلص ہے وہ شیخ کبھی استعمال نہیں کرتے تھے۔ ڈاکٹر نظامی بعدہ شیخ عبدالوحید ابراہیم کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ شیخ فرید کے نام سے منسوب ہونے والے کئی اشعار شیخ عبدالوحید ابراہیم نے بھی نقل کیے ہیں۔ پاکستان کے ممتاز دانش ور مسٹر مسعود حسن شہاب نے اپنی کتاب ''خطۂ پاک اوچ'' (صفحات ۳۷۶-۳۷۷) میں شیخ فرید کی پنجابی شاعری پر مختصراً روشنی ڈالی ہے۔ مسٹر شہاب بڑے وثوق سے یہ کہتے ہیں کہ ملتانی بولی جو شیخ فرید نے استعمال کی ہے اور اوچ کے عوام کی موجودہ زبان میں بڑی مشابہت ہے۔ واضح رہے کہ شیخ فرید نے کچھ عرصہ اوچ میں قیام کیا تھا اور یہاں اپنا 'چلۂ معکوس' مکمل کیا تھا۔ یہ بھی یاد رہے کہ پنجابی زبان نہ صرف اردو سے کہیں پرانی ہے بلکہ اردو کا سرچشمہ بھی ہے۔ اردو کے مؤرخین میں اس بات پر اتفاق ہے کہ

شیخ فرید بھی ان صوفیاء میں شامل تھے جنھوں نے اردو کے عنفوانِ شباب کے ادوار میں اردو کی ترقی میں حصہ لیا۔ اب رہے وہ پنجابی اشعار جو شیخ فرید سے منسوب ہیں تو سُنی سنائی روایات سے مفر ناگزیر ہے اور اس مفروضے سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان میں سے کچھ اشعار یقیناً شیخ ہی کے لکھے ہوئے ہیں۔ جو لوگ اس بات کا شدت سے انکار کرتے ہیں کہ شیخ فرید شاعر تھے ان میں مسٹر وحید احمد مسعود بھی شامل ہیں۔ انھوں نے اپنی تصنیف لطیف ''سوانح حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکر[۲۳]'' میں اس مسئلے پر بڑی ٹھوس اور جامع بحث کی ہے۔ تاہم ان کے تمام دلایل کو تسلیم کرنا ممکن نہیں ہے بہرحال ایک ولی کے لیے شاعر ہونا کوئی معیوب امر نہیں ہے بلکہ اس کے برعکس صوفیانہ تجربات اکثر و بیشتر شاعرانہ اسلوبِ بیان کا جامہ پہن لیتے ہیں۔ ٹائٹس برک ہارٹ جب یہ کہتے ہیں تو کتنا درست کہتے ہیں کہ یہ بات بڑی معنی خیز اور اہم ہے کہ ایک بھی مسلم ماہر مابعدالطبیعیات ایسا نہیں ہے جس نے شعر نہ کہے ہوں اور جس کی دقیق نثر شاعرانہ تصورات سے مالامال متناسب و رواں زبان میں نہ لکھی گئی ہو۔ دوسری طرف محبت کے ترانے گانے والے بیشتر شعراء مثلاً عمر بن الفرید[۲۴] اور جلال الدین رومی[۲۵] کی شاعری عقلی شعور و ادراک سے مالامال ہے۔

(''صوفیاء کے عقاید سے تعارف'' مصنفہ ٹائٹس برک ہارٹ ، مطبوعہ لاہور)

یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ شیخ فرید کے کچھ ہم عصر ممتاز صوفی اور شیخ کے دوست مثلاً لال شہباز قلندر[۲] اور عراقی[۳] عظیم شاعر بھی تھے - نوعِ بشر کے قادر الکلام صوفی شاعر رومی[۳] بھی اسی دور سے تعلق رکھتے تھے اور اگرچہ ان کی اور شیخ فرید کی کبھی ملاقات نہیں ہوئی تاہم ان میں بڑی واضح مماثلت ہے یا محدود الفاظ میں یوں کہہ لیجیے کہ کم از کم ان کی رسائی ایک سی ہے -

رومی کی مثنوی ایک نے کے شکوے سے شروع ہوتی ہے - یہ نے انسانی روح کے اپنے منبع یعنی خدا کی جانب رجوع کرنے کی آرزو کی طرف اشارہ کرتی ہے - شیخ فرید کی ایک مناجات میں بھی اسی آرزو کی جھلک ملتی ہے - اس مناجات کا جو ترجمہ میکس آرتھر میکالف نے اپنی کتاب میں کیا ہے وہ پیشِ خدمت ہے :

''خدا سے جدائی کے باعث میں تپ کی شدید گرمی میں جل رہی ہوں اور کفِ افسوس ملتی ہوں - مجھے اپنے آقا سے ملنے کی آرزو نے سودائی بنا رکھا ہے - اے میرے آقا آپ کے دل میں میرے لیے غصہ ہے اور اس کی وجہ میری خامیاں ہیں - میرے آقا کا اس میں کوئی قصور نہیں - میرے

مالک میں آپ کی قدر و قیمت کو نہیں جانتی تھی۔
میں نے اپنی جوانی گنوا دی ۔ مجھے اس پر پشیمانی
ہوئی ، لیکن کتنی دیر سے ہوئی ۔ او کالی کویل
تم کیوں کالی ہو ؟

کویل : میں اس لیے کالی ہوں کہ مجھے میرے
محبوب کی جدائی نے جلا ڈالا ہے ۔ کیا اپنے
محبوب سے جدا رہنے والی کبھی سکھی رہ سکتی ہے؟
اگر میرے آقا کے دل میں رحم پیدا ہوا تو وہ
اپنی اور میری ملاقات کے لیے کوئی سبب بنا
دے گا۔ وہ کنؤاں کتنا اذیت ناک ہے جس میں
اکیلی عورت گرے پڑی ہے ۔ اس کا کوئی ساتھی
نہیں ، کوئی مددگار نہیں ۔ اے خدا فضل و کرم
سے کام لے اور اپنے ولیوں سے میری ملاقات کا
سبب بنا ۔ جب میں دوبارہ دیکھتی ہوں تو خدا
کو اپنا مددگار پاتی ہوں ۔ میری راہ بڑی کٹھن
اور تھکا دینے والی ہے ۔ یہ بڑی تنگ ہے اور
دو دھاری تلوار سے بھی زیادہ تیز ہے ۔ اسی راہ
پر میں نے سفر کرنا ہے ۔ اے شیخ فرید ! اس
کٹھن راہ پر سفر کرنے کے لیے پہلے ہی سے تیّار
ہو جاؤ ۔''

دوسری طرف مسٹر مقبول الٰہی ہیں جنھوں نے اپنی

زندگی کا بیشتر حصہ پنجابی صوفیانہ شاعری کے ٹھوس مطالعے میں گزارا ہے ۔ حال ہی میں انھوں نے گرنتھ صاحب کے شلوکوں کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے ۔ مسٹر مقبول الٰہی نے بابا فرید کے دوہے بھی مرتب کیے ہیں جنھیں مجلس شاہ حسین ، لاہور نے ۱۹۶۷ء میں شایع کیا ۔ اب ایک گروہ کی رائے یہ ہے کہ شیخ فرید شاعر نہیں تھے ، ان سے منسوب اشعار لوگوں نے کہے ہیں ؛ جب کہ دوسرے گروہ کی رائے یہ ہے کہ شیخ فرید شاعر تھے ۔ سب کچھ کہنے سننے کے بعد سچائی غالباً ان دونوں انتہائی آراء کے بین بین ہے اور ہم بلا خوفِ تردید یہ کہہ سکتے ہیں کہ شیخ فرید نے یقیناً عربی ، فارسی اور پنجابی میں کچھ اشعار کہے ہیں کیونکہ وہ یہ تینوں زبانیں بخوبی جانتے تھے ۔ ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ انھوں نے زیادہ تر اشعار اپنی مادری زبان پنجابی میں لکھے ۔ ہم یہاں مسٹر مقبول الٰہی کے انگریزی مجموعے میں سے شیخ فرید کا ایک دوہا نقل کرتے ہیں جو انتہائی مؤثر ہے :

فریدا ! کالے مینڈے کپڑے ، کالا مینڈا ویس
گناہیں بھریا میں پھراں لوک کہن درویش

(اے فرید ! کالے میرے کپڑے ہیں اور کالا ہی میرا چغہ ہے ۔ میں گناہوں کے بوجھ سے لدا ہوا گھومتا ہوں اور لوگ مجھے درویش کہتے ہیں)

ایک اور دانش ور مسٹر نجم حسین سید ہیں جو شیخ فرید الدین گنج شکرؒ کو پنجابی کا پہلا شاعر قرار دیتے ہیں۔ ان کی تصنیف لطیف ''پنجابی شاعری میں مکرر الوقوع نمونے'' میں ایک باب کا عنوان ہے: ''فرید کی شاعری میں سادگی و تیزی''۔ اس باب میں انھوں نے شیخ فرید کی شاعری کی روحانی و فنی خوبیوں پر بڑی مہارت سے بحث کی ہے۔ ہم یہاں سکون و اطمینان سے ان کا ایک پیراگراف نقل کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں :

''فرید کے اشعار ان کے فوری تجربات کا نچوڑ ہیں۔ یہ تجربات ہر انسان کو اس کی روزمرہ زندگی میں پیش آتے ہیں۔ کسانوں اور مزدوروں کی محنت کی تحسین شیخ فرید کی اساسی شاعری کا لطیف و نازک امتیازی لازمہ ہے اس لیے ان کی شاعری بظاہر روکھی پھیکی اور سب سے الگ تھلگ نظر آتی ہے :

کوک ، فریدا کوک ، توں جیویں راکھا جوار
جب لگ ٹانڈا نہ گرے تب لگ کوک پکار

(یعنی اے فرید ! جوار کی فصل کے محافظ کی طرح چیختے رہو۔ تمھاری یہ چیخ پکار اس وقت تک جاری رہنی چاہیے جب تک فصل پک کر کٹ نہ جائے)

فرید کے لہجے میں ایک چھپی ہوئی متانت ہے جو اس دوہے کے اشاراتی مافیہ کو واضح کرتی ہے۔ جب تک انسان باطنی پختگی حاصل نہ کر لے اسے بیدار مغزی سے کام لینا چاہیے اور اپنی زیادہ سے زیادہ چوکسی کرنی چاہیے۔ مزید برآں چوکس انسان کی چیخ پکار خود آگاہی اور نقصان سے دور رہنے کی نمایندگی کرتی ہے اور اس سے چوکیدار کے فکرمند ذہن کے احساسات کو بھی نکاسی کا راستہ ملتا ہے۔ جب فصل کے پکے ہوئے پودے حفاظت سے جمع کر لیے جاتے ہیں تو چیخ پکار رک جاتی ہے۔ اسی طرح جب زندگی اپنے اختتام کو پہنچتی ہے اور دنیا میں قیام کا ثمر، جو رشک و حسد کی شاخ سے لگ کر پھولتا پھلتا ہے، حاصل ہو جاتا ہے تو آسودگی کی خاموشی طاری ہو جاتی ہے۔ فرید کے تصور نے اس تمام عمل اور اس کے اختتام کو چند الفاظ میں محیط کر دیا ہے۔ اس تصور کا، جو کھیت کی ہیجان خیز سرگرمی سے لیا گیا ہے، عارف کی مستحکم آواز سے اشتراک ہے۔

دوہوں پر واضح لیکن مختصراً بحث کرتے ہوئے اس بات کی تعریف کی جا سکتی ہے کہ فرید کی

شاعری اپنی مخصوص انفرادیت برقرار رکھتے ہوئے
مناسب طریقے سے پنجابی شاعری کی روایت میں
اپنا مقام حاصل کرتی ہے ۔ فرید کی قوت تخلیق
اور جدت پسندی کی وجہ ان کا مزاج اور ان کے
نظریات ہیں ۔ ان کے اشعار سے یہ غلط فہمی نہیں
پیدا ہو سکتی کہ وہ بعد کے شاعروں کے لکھے ہوئے
ہیں ۔ نہ صرف اس لیے کہ ان اشعار کی نوعیت میں
کوئی فرق نہیں بلکہ ان کی امتیازی حیثیت میں
بھی کوئی فرق نہیں ۔ اس پر بھی بعد کے شعراء
شیخ فرید کو اپنا بزرگ قرار دینے کے دعوے
میں حق بجانب ہوں گے ۔ ہم اپنی حیثیت کے
مطابق شیخ فرید میں ان مکررالوقوع نمونوں کی
پہلی نمود دیکھ سکتے ہیں جس نے روایت کی
حرکت کے اظہار کے لیے دوسرے بڑے شعراء
کی تخلیقات میں روح پھونکی ۔ جیسا کہ پہلے ذکر
کیا جا چکا ہے اشعار کا تجزیہ کرنے سے ان
نمونوں کو اس بات سے پہچانا جا سکتا ہے کہ
فرید نے معانی کو زیادہ سے زیادہ واضح کرنے
کے لیے فن کے مختلف پہلوؤں کو کام میں
لاتے ہوئے آرایشی و زیبایشی الفاظ کے استعمال
سے مکمل اجتناب کیا ۔ انھوں نے جو کچھ بھی

اور جس سطح پر بھی کہنا چاہا اس کے لیے
بڑے اعتماد سے اپنے اشعار کی ساخت سادہ رکھی
اور عام تجربے کے لیے اپنی قوتِ متخیلہ استعمال
کی۔ مفکرانہ و مؤثر میلانِ طبع کے باوجود الفاظ
کے استعمال میں ڈرامائی کفایت شعاری سے کام لیا
اور بنیادی و ضروری مسایل کو اپنے اشعار کے
موضوعات بنانے میں مستقل مزاجی کا مظاہرہ
کیا۔'' (صفحات ۲۹-۳۰)

ایک اور ممتاز متخصص سید مسلم نظامی اپنی کتاب
''انوارالفرید'' میں دوسرے دانش وروں کی اس رائے سے
اتفاق کرتے ہیں کہ شیخ فرید ایک عظیم صوفی شاعر تھے ،
تاہم ان کا خیال ہے کہ شیخ کی مادری زبان فارسی تھی ۔
وہ مزید دلیل دیتے ہیں کہ شیخ ہمیشہ اپنے آپ کو مسعود
کہتے تھے فرید نہیں کہتے تھے ۔ ان کا کوئی بھی ہندی دوہا
شلوکوں سے کہیں عمدہ ہے اس لیے پنجابی اشعار جو شیخ
سے منسوب کیے جاتے ہیں ان کے نہیں ہیں ۔ اگر ایسا ہو بھی
تو اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ زیرِ بحث پنجابی شاعری
انسانی روح کی ان کیفیات اور نشیب و فراز کی تصویر
کھینچتی ہے جن کا بابا فرید کو تجربہ ہوا ۔ یہ بات بھی
قابلِ فہم ہے کہ شیخ روزمرہ کی بول چال میں تو اپنے آپ
کو مسعود کہتے ہوں گے لیکن لفظ فرید انھوں نے تخلص

کی حیثیت سے استعمال کیا ۔ شیخ فرید ثانی کی مدد سے ہی عوام نے بابا فریدؒ کی پنجابی شاعری ایک خزینے کی طرح محفوظ رکھی ۔ یہ بات بھی ممکن ہے کہ شیخ بچپن سے ہی دو یا اس سے زیادہ زبانیں جانتے ہوں ۔

آخر میں شیخ کی شاعری کے بارے میں ایک بالکل مختلف تناظر پر توجہ دینا بھی مناسب ہوگا ۔ اسے آئی سیریبرایا کوف مصنف ''پنجابی لٹریچر'' نے اختیار کیا ہے لیکن یہ دو اعتبار سے ناقص ہے ۔ اول یہ کہ ایک سچے صوفی کو موت کے ناگزیر اور بے درد ہونے کا احساس ہو جائے تو اس کے دل و دماغ سے خدا کا خیال کم ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا ۔ سلسلۂ چشتیہ کے اولیاء نے ہمیشہ موت کو ایک ایسے پُل کی مانند سمجھا ہے جو محبِ و محبوب کو آپس میں ملا دیتا ہے ۔ مزید برآں شیخ فرید خدا سے اپنی عقیدت کے معاملے میں کبھی ڈانواں ڈول نہ ہوئے اور زندگی کے آخری ایام میں ارادتاً نہیں بلکہ بغیر کسی سعی کے ہی یہ عقیدت ان کے دل میں راسخ ہو چکی تھی ۔ وہ بڑے تواتر سے اس امر کا اقرار کیا کرتے تھے کہ میں خدا کے لیے زندہ ہوں اور اسی کے لیے مرتا ہوں ۔ اسی اقرار نے درحقیقت ان کی ہستی کی تراش خراش کی تھی ۔ یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیے کہ ایک صوفی موت کے منفی پہلو پر غور کرتا ہے تاکہ وقت کے تخریبی پہلو اور تمام مظاہرِ قدرت کی

حیاتِ چند روزہ کا ادراک ہو سکے۔ اسی سے صوفی اس قادرِ مطلق ذاتِ لاشریک اور ہمارے واحد منبع کے مثبت ادراک کی جانب رہنمائی حاصل کرتا ہے ۔ ہم موت کی وساطت سے خدا کی طرف رجعت کرتے ہیں اور یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی اپنے گھر آ جائے ۔ دوم یہ کہ شیخ فرید کی شاعری کے متعلق یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ وہ تقلید پسند اور راسخ العقیدہ مسلمانوں کے خلاف تھی ۔ وہ تقلید پسندی کے مخالف نہیں تھے کیونکہ تقلید پسندی ہر سچے مذہب کی آفقی سمت ہے اور نہایت ضروری ہے کیونکہ کوئی بھی بیج اگر چھلکے کے بغیر بویا جائے تو وہ نہیں اُگتا ۔ شیخ اگر مخالف تھے تو صرف مکر و ریا اور ظلمت پسندی کی سخت پرت کے ۔ یہ پرت دراصل مذہب کے اجارہ داروں اور مذہب سے دنیوی فواید اُٹھانے والوں کی تھی ۔ یہ لوگ تقلید پسندی کے متعلق اپنی حقیر فہم کو کا۔ہم رسولِ اکرم صلعم کے مشن کے برابر گردانتے تھے اور یہ نہیں سمجھتے تھے کہ اس مشن کی ایک راسی سمت بھی ہے ۔

ان دو استثنائی فقروں کے ساتھ ہم اپنے قارئین سے مسٹر سیریبرایاکوف کی اس قیمتی تنقید و تحقیق کی تعریف و توصیف کرتے ہیں جو انھوں نے شیخ فرید کی شاعری پر کی ہے :

''پہلے دور کے ہندو مسلمانوں کے تال میل سے

پیدا ہونے والے ادب کا بہترین اسلوب بیان
شیخ فرید گنج شکرؒ (۱۱۷۳ء-۱۲۶۶ء) نے پیش
کیا ۔ وہ اُمراء کے خاندان میں پیدا ہوئے ۔
روایتی اسلامی تعلیم حاصل کی ۔ ان کی زندگی کا
بیشتر حصہ ملتان میں گزرا جو بڑا اہم ثقافتی
مرکز تھا اور جہاں قرمطی اثرات ابھی تک
عام تھے ۔ انھوں نے بغداد اور خراسان ایسے
وقیع اسلامی مراکز کا بھی دورہ کیا ۔

فرید کی شاعری میں سے ایک سو تئیس نام نہاد
شلوک ہم تک پہنچے ہیں ۔ یہ شلوک در اصل
مختلف بحور کے دوہے ہیں ۔ ان کے علاوہ چالیس
مصرعوں کی ایک نظم ''نصیحت نامہ'' بھی ہے ۔
اس نظم کی زبان ملتانی ہے جو ازمنہ وسطیٰ کے
پنجاب کی ادبی زبان تھی ۔

آن کی تحریر پر ہندو شاعری کا نمایاں اثر
محسوس ہوتا ہے خصوصاً ''ناتھ اور بھگتی'' نامی
نظم جس کا طرز تخیل صوفیانہ شاعری سے بڑی
مماثلت رکھتا ہے ۔ تصوف یہ سکھاتا ہے کہ
نجات صرف خدا کی معرفت سے ہی حاصل ہو سکتی
ہے اور آدمی خدا کی معرفت درویش بننے سے
حاصل کر سکتا ہے ۔ درویش بننے کا مطلب

یہ ہے کہ دنیا سے کنارہ کشی کر کے روحانی بھاکت کا وارث بنایا جائے کیونکہ اس طرح ہی بالآخر روح کا ذات مطلق سے اتحاد ہو گا ۔ انسان چاہے کتنا ہی عبادت گزار اور پارسا کیوں نہ ہو خود اس راہ کو طے نہیں کر سکتا ، اسے کسی مرشد یا پیر کی رہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے ۔ اس راہ پر صرف وہی گامزن ہو سکتے ہیں جن کے دلوں میں خدا کی معرفت حاصل کرنے کی لگن اتنی سچی اور طاقت ور ہو کہ وہ اس کے لیے ہر دنیوی چیز کو چھوڑ دیں ۔ سو یوں تصوف بھگتی کی تعلیمات سے بہت ملتا جلتا ہے ، دونوں کی قوت متخیلہ ایک سی ہے ۔ ارضی زندگی ایک دھوکا ہے ، برائی ہے ، زہر ہے ؛ ایک ایسی چنگاری ہے جو جذبات کی آگ بھڑکاتی ہے اور ایک ایسی آگ ہے جو راکھ تلے بھڑکتی رہتی ہے ۔ روح کے ذات واحد میں مدغم ہونے سے ہی نجات مل سکتی ہے کیونکہ ذات واحد ہی مظاہر کائنات میں ہمیشہ زندہ و باقی رہتی ہے ۔ صرف مرشد ہی انسان کو ہستی کے طوفانی سمندر اور زندگی کے بے کراں دریا سے پار لے جا سکتا ہے ۔ مرشد کے تجربہ کار ہاتھ ہی کشتی مراد کو

منزلِ مقصود پر پہنچا سکتے ہیں ۔ اس منزل پر پہنچنے کے لیے انسان کے دل میں خالص اور مکمل ایمان کا ہونا ضروری ہے ۔ ایسا ایمان جو ایک جذبے کی مانند ہو ، سوتوں کو جگانے والا ہو ، پرخلوص ہو ۔ ایسا ایمان جو انسان کو حرص ، کاہلی اور کاسہ لیسی ایسے گناہوں سے پاک کر دے ۔

شیخ فرید کی غنائی نظمیں انہی خیالات کی حامل ہیں ۔ متعدد دانش ور انھیں ایک مذہبی شاعر سمجھتے ہیں مگر ان کے تخیل کی مذہبی شاعرانہ روایت سے مطابقت کی اکثر یوں تعمیم کی جاتی ہے کہ ان کی عام جذباتی نظموں میں بھی صوفیانہ معانی تلاش کر لیے جاتے ہیں حالانکہ یہ مشکل سے ہی صحیح ہوتا ہے ۔ ان کی اکثر نظموں میں ارضی جذبات کی رنگ آمیزی ہے ۔ مثلاً:
'آج میں اپنے محبوب کے ساتھ رات نہ بسر کر سکی چنانچہ میرے جسم کی ایک ایک ہڈی دکھ رہی ہے ۔ کاش وہ آتا تو میں اس سے پوچھتی کہ وہ رات کیوں نہیں آیا ؟'

تصوف اور بھگتی کی شاعری میں محبوب کا مطلب خدا ہوتا ہے ، یعنی خدا کو روح کا محبوب

سمجھا جاتا ہے ۔ دوسری طرف پارسا اور عبادت گزار کی روح کو ایک ایسی بیوی یا مثالی خاتون تصور کیا جاتا ہے جو خدا سے ملنے کی سعی میں مصروف ہو ۔ تاہم اگر اس توضیح کا شیخ فرید کے سادہ ، فن کاری سے دور اور پُر خلوص مصرعوں پر اطلاق نہ کیا جائے تو پھر بھی ان کی شاعرانہ عظمت برقرار رہتی ہے جب کہ صوفیانہ مذہبی متلازم ابدیت ضروری نہیں ۔

ایک اور نظم میں عمر کے تیزی سے بڑھاپے کی جانب بڑھنے پر غور و فکر کیا گیا ہے ۔ شاعر کہتا ہے :

'جن پرندوں نے تالاب میں بسیرا کیا تھا وہ اڑ گئے ہیں ۔ اے فرید ! ایک دن یہ سارا تالاب خشک ہو جائے گا ، صرف ایک تھکا ماندہ کنول اکیلا رہ جائے گا ۔'

زندگی اپنے اختتام کے قریب پہنچ رہی ہے اور فرید موت کے کٹھورپن کا احساس کرتے ہوئے اس کے ناگزیر ہونے پر شیون کرتے ہیں ۔ سوائے قصداً توضیح و تشریح کے عمیق تصورات اور گیان دھیان کی کیفیت بھی خدا کے خیالات کو

نہیں ابھارتی۔

اس طرح لگے بندھے صوفیانہ و مذہبی نظریات کے علی الرغم فرید کی شاعری میں وقت کے تقاضوں کے مطابق دورِ جدید کی امتیازی خصوصیات اور مخصوص رجحانات بھی در آئے ہیں۔ شاعر خود اپنی حیثیت کا بڑے غیر مبہم انداز میں اعلان کرتا ہے۔ اپنے مرید سیدی مولا کو تنبیہہ کرتے ہوئے شیخ لکھتے ہیں :

'بادشاہوں اور امراء کی صحبت اختیار نہ کرو۔ یاد رکھو کہ تمہارا ان کے ہاں آنا جانا تمہاری روح کو مردہ کر دے گا۔'

امارت کے خلاف یہ رویہ قدرتاً عوامی ہمدردی کے پیشِ نظر اختیار کیا گیا تھا کیونکہ شیخ نے عوام سے جو پیمانِ وفا باندھا تھا وہ اس سے آگاہ تھے :

فریدا! میں جاتا دکھ مجھ کوں، دکھ سبائے جگ
اوچے چڑھ کے ویکھیا تاں گھر گھر ایہو اگ

(اے فرید! میں سوچتا تھا کہ روئے زمین پر صرف میں ہی دکھی ہوں، لیکن مجھے پتا چلا کہ تمام دنیا دکھی ہے۔ جب میں نے ایک ٹیلے

پر چڑھ کر نظر ڈالی تو میں نے دیکھا کہ ہر
گھر کے افراد اسی آگ میں جل رہے ہیں)
چونکہ ان مصرعوں کا پیغام ایک خاص پردے
میں چھپا ہوا اور عوامی عقاید کے قریب تر ہے
اس لیے عوام میں بڑا مقبول ہے - فرید نے نہایت
مؤثر اور خوش گوار الفاظ کے انتخاب سے خاصا
جمالیاتی نتیجہ حاصل کیا ہے - اُن کی فنی پیچیدگیوں
سے آزاد زبان اور سادہ نحو سے اس تمنا کا اظہار
ہوتا ہے کہ عوام انہیں سمجھ سکیں ، اسی لیے
وہ عوام سے انہی کے الفاظ میں خطاب کرتے ہیں -
یہی ان کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے اور اس سے
وہ تمام اعترافات وابستہ ہیں جو تقلید پسند مذہب
کے خلاف ہیں -" (صفحات ۲۲-۲۴)

٦

تاریخ کا خراج عقیدت

ایم ـ آئی ـ فنلے اپنی تصنیف ''قدامت کے پہلو'' میں لکھتے ہیں :

''کئی مقامات ایسے ہوتے ہیں جو قدرتاً انسان کے دل میں اسراریت کی دھاک بٹھاتے ہیں ـ اسے مذہب کے طالب علم خدا اور مذہب کے متعلق انسانی احساسات کی خوبی کہتے ہیں ـ اس سلسلے میں ڈلفی کی مثال پیش کی جا سکتی ہے ـ یونان میں ڈلفی کا مندر دیکھنے والوں کو آج بھی جدید ہوٹلوں ، بہترین دکانوں ، کھڑی کاروں اور سیاحوں کی بسوں کی موجودگی میں سب سے زیادہ اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ یہاں غاریں اور چشمے بھی ہیں ـ''

پاکپتن جانے والے زایر بھی اسے بہترین خدائی اور مذہبی مقام کہتے ہیں ـ یہ شہر بڑا قدیم ہے اور اسی ضلع میں واقع ہے جہاں ہڑپہ ہے ـ جنرل کننگھم کے نزدیک ''یہ وہ شہر ہے جس کے باشندوں کا سکندر اعظم کے عہد کے مؤرخوں اور دوسرے قدیم مصنفین نے بھی تفصیلی ذکر کیا ہے ـ'' ماضی میں کئی فاتحین بھی اس مقام سے گزرے

لیکن اس مقام کی موجودہ عظمت کے سامنے ان کے ان تھک دھاوے ، ان کی خون آشام جنگیں اور خون رنگ فتوحات غیر اہم ہو کر رہ گئی ہیں - کوئی خاص مؤرخ ہی ان معرکوں کو دوبارہ یاد کر کے گوشۂ گمنامی سے نکال سکتا ہے - پاکپتن ، جس کا قدیم نام اجودھن ہے ، شیخ الاسلام شیخ فریدالدین مسعود گنج شکرؒ سے تعلق کی بنا پر ابدی تقدس حاصل کر چکا ہے . پاکپتن کو یہ مقدس مذہبی اعزاز اس لیے حاصل ہے کہ یہاں شیخ فریدؒ کے مزار کی تابندگی ہے -

یہ شہر بلند جگہ پر واقع ہے اور اس کا اونچا پہلو زایر کو خوش آمدید کہتا ہے - جوں ہی زایر کی نگاہ اس عالی مرتبت شہر پر پڑتی ہے اُس کی روح بلند ہو جاتی ہے - یہ وہ مقام ہے جو ہر طرف امن پھیلاتا ہے - جب خوف ناک شہنشاہ تیمور اس شہر میں پہنچا تو اس کی پُر امن فضا نے اُس پر معجزانہ اثر کیا - تیمور خانقاہ کے حیرت انگیز تقدس سے بڑا مرعوب ہوا چنانچہ اس نے شیخ کی بزرگی کے احترام میں اس شہر کے باشندوں کی جاں بخشی کر دی - دنیا کا عظیم سیاح ابن بطوطہ ، جس نے شمالی افریقہ اور شرقِ اوسط کی بے شمار خانقاہیں دیکھی تھیں ، جب اس شہر میں پہنچا تو شیخ کی خانقاہ میں اسے بڑی کشش محسوس ہوئی - عظیم سلطان فیروز شاہ تغلق بھی ان بے شمار حکمرانوں میں شامل

ہے جنھوں نے شیخ کو خراجِ عقیدت پیش کرنے اور اُن کے مقدس مزار کی زیارت کے لیے بطورِ خاص اس شہر کا سفر اختیار کیا - ہر دور کے مؤرخین شیخ کی عظمت کے ترانے گاتے رہے اور شیخ کا ذکرِ خیر کرتے رہے - مثلاً ضیاء الدین برنی ''تاریخِ فیروز شاہی'' میں ہمیں بتاتے ہیں کہ جب فیروز شاہ درگاہ پر حاضر ہؤا تو اس نے شیخ کی اولاد پر خاص توجہ دی کیونکہ شیخ کی اولاد بڑے کٹھن دن بسر کر رہی تھی - سلطان نے انہیں بے شمار عطیات دینے کے علاوہ اراضی بھی دی - شیخ کو مزید خراجِ عقیدت پیش کرنے کے تحت سلطان نے اجودھن کے باشندوں کے حق میں بھی بڑی کریم النفسی سے کام لیا - تمام لوگوں کو کھلے ہاتھوں سے مال و دولت دی ، محتاجوں کو نہال کر دیا اور مستحقین کے وظایف بحال کر دیے - کافی عرصے کے بعد برصغیر میں دودمانِ مغلیہ کے بانی شہنشاہ بابر نے جب اُن علاقوں پر تاخت و تاراج کی تو خونی جنگوں نے ایک بار پھر پاکپتن کو گھیر لیا اور اس شہر نے ایک مرتبہ پھر اُن تمام لوگوں کو پناہ دی جو اپنی جان بچانے کے لیے اس شہر میں آ گئے تھے - بابر کے نامور پوتے اکبر کو اولادِ نرینہ کی بڑی آرزو تھی - چنانچہ اس دور کے عظیم درویش شیخ سلیم چشتیؒ کی دعا سے اس کو خدا نے تین فرزند عطا کیے - یہ شیخ سلیم چشتیؒ شیخ فریدؒ کی اولاد تھے - شہنشاہ اکبر

نے پہلے پنجاب میں شیخ سلیم کے مولد کی زیارت کی اور پھر شیخ فرید ؒ کی خانقاہ پر پہنچ کر انھیں ہدیۂ عقیدت پیش کرنے کا فیصلہ کیا - جب وہ اجودھن کے قریب پہنچا تو گھوڑے سے اتر کر پاپیادہ ہو گیا اور کئی میل پیدل چل کر درگاہ پر حاضری دی - یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ بادشاہ کے حاشیہ نشینوں نے بھی یہی طرزِ عمل اختیار کیا - اکبر کے اتالیق بیرم خاں خان خاناں نے بھی درجِ ذیل شعر میں شیخ کی عظمت کے گن گائے اور شیخ کے ایک معجزے کو زندۂ جاوید کیا ہے :

کانِ نمک ، جہانِ شکر ، شیخِ بحر و بر
آن کز نمک شکر کند وز نمک شکر

شہنشاہ شاہجہاں کے بڑے اور پیارے بیٹے شہزادہ داراشکوہ نے بھی اپنی کتاب ''سفینۃ الاولیاء'' میں شیخ کا ذکر بڑے احترام و عقیدت سے کیا ہے - یہ عقیدت و احترام آج بھی لاکھوں افراد کے دلوں میں موجود ہے - تصوف پر لکھنے والے اپنی تخلیقات کے صفحات شیخ کے احترام سے آراستہ کرنے کے لیے ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی بڑھ چڑھ کر کوشش کرتے رہتے ہیں - کچھ ایسے بھی ہیں جو روحانی سکون حاصل کرنے اور دلوں کو منور کرنے کے لیے گھنٹوں درگاہ کے کسی حجرے میں خدا کی عبادت کرتے ہیں یا شیخ کی معطر قبر کے پاس بیٹھ کر تلاوت

قرآنِ پاک اور سلسلۂ چشتیہ کا ورد کرتے ہیں ۔ برِصغیر کے دور اُفتادہ علاقوں کے دانش ور ، مذہبی رہنما اور عوام اب بھی درگاہ کی پُرامن اور پُرسکون فضا سے بڑے مسحور ہوتے ہیں ۔ سالانہ عرس کی ایک اہم خصوصیت بہشتی دروازہ ہے ۔ شیخ کے متعلق تحقیقی کام کرتے ہوئے اس دروازے کا بیان بھی بڑا ضروری ہے ۔ شیخ ایک ایسے حجرے میں مدفون ہیں جس کے دو دروازے ہیں ۔ ایک دروازہ مشرق میں ہے اور دوسرا جنوب میں ۔ زایرین عموماً مشرقی دروازے سے حجرے میں داخل ہوتے ہیں ۔ حجرے میں داخل ہوں تو سب سے پہلے شیخ کے صاحب زادے شیخ بدر الدین سلیمان کی قبر آتی ہے جو باپ کی وفات پر پاکپتن کی گدی پر متمکن ہوئے تھے ۔ دوسری قبر شیخ فریدؒ کی ہے ۔ قبر کے مغرب میں خاصی جگہ ہے جہاں زایرین بیٹھ کر تلاوتِ کلامِ پاک کرتے ہیں ۔ پیچھے شمال کی جانب جالی دار دیوار ہے ۔ یہاں خواتین آ کر خراجِ عقیدت پیش کرتی ہیں ۔ جنوبی دیوار میں بہشتی دروازہ ہے جو ہر سال محرم میں عرس کے موقع پر کھولا جاتا ہے ۔ یہ تقریباً دو فٹ چوڑا اور اتنا نیچا ہے کہ کوئی بھی شخص جھکے بغیر اس میں سے گزر نہیں سکتا ۔ اس دروازے میں سے گزرنے والوں کو یہ اعتقاد ہوتا ہے کہ اُن پر بہشت کے دروازے وا ہو گئے ہیں ۔ یہ عقیدہ ایک قدیم زبانی روایت پر مبنی ہے اور اس کی بنیاد

شیخ نظام الدین اولیاءؒ کے ایک رویا پر ہے ، تاہم کسی ہم عصر یا متاخر مصنف نے اس کا حوالہ نہیں دیا ، پھر بھی اس تقریب کی تاثیر کے متعلق عوام کا عقیدہ غیر متزلزل ہے - بہر کیف اس تقریب کی ادائیگی عوام کو نہ صرف باطنی تناؤ سے نجات دیتی ہے بلکہ خدا کی بے پایاں رحمت و شفقت پر ان کا اعتماد بحال ہو جاتا ہے اور وہ پارسائی کی راہ پر زندگی کے تازہ دور کا آغاز کرتے ہیں -

زایرین درگاہ سے ملحق مسجدِ نظامی میں بھی بڑے ذوق شوق سے نماز پڑھتے ہیں - یہ مسجد سنگِ مرمر کی بنی ہوئی ہے اور مسلم فنِ تعمیر کا ایک نادر نمونہ ہے - اس کے ڈھانچے میں الوہی نفاست و نزاکت ہے اور سبک ، روشن اور پھول کی طرح تر و تازہ نظر آتی ہے - اسے شیخ فریدؒ کے روحانی جانشین شیخ نظام الدین اولیاءؒ کی یاد میں تعمیر کیا گیا ہے جو اس مقام پر خدا کی عبادت کیا کرتے تھے اور جنھوں نے اپنے مرشد کے پیغام کی شمع نصف صدی تک دہلی میں روشن رکھی -

بطور امرِ واقع آنے والی نسلوں پر شیخ فرید کے اثرات معین کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ شیخ نظام الدین اولیاءؒ کی زندگی کا مقصدی مطالعہ کیا جائے - اس سلسلے میں ہم ایک معیاری کتاب سے طویل اقتباس نقل کرتے ہیں جس سے اس امر کا اندازہ ہو سکے گا کہ شیخ فریدؒ کے

مشن نے بلاواسطہ اور کلی حیثیت سے کتنی کامیابی حاصل کی :

''لیکن اگر خسرو کو علاء الدین کے عہد میں تکالیف اور سختیاں برداشت کرنا پڑتیں تو وہ انہیں راضی برضا رہ کر بڑے سکون و صبر سے برداشت کرتے کیونکہ وہ اپنی زندگی کے ایک نئے دور میں داخل ہو چکے تھے - ۶۷۱ھ میں انہوں نے دہلی کے ممتاز ولی نظام الدین اولیاءؒ کے حلقۂ ارادت میں شرکت کی کہ وہ ان ولی کو اپنے بچپن اور جوانی سے جانتے تھے، چنانچہ انہوں نے شیخ نظام الدین اولیاءؒ کی مریدی اختیار کرکے ایک مکمل صوفی کی حیثیت سے زندگی کا آغاز کیا - محمد ابن احمد ابن علی البخاری نظام الدین اولیاءؒ ، جو سلسلۂ چشتیہ کے بڑے ممتاز اور قابلِ احترام ولی تھے اور لوگ انہیں سلطان الاولیاء کہتے تھے ، بدایوں میں ۶۳۴ھ میں تولد ہوئے - اُن کے دادا خواجہ علی بخارا سے نقلِ وطن کرکے ہند آئے - پہلے لاہور میں قیام کیا اور پھر بدایوں چلے گئے - چنانچہ شیخ بھی اپنے پیارے مرید خسرو کی طرح ترک نژاد تھے - جب شیخ کی عمر پانچ سال کی ہوئی تو اُن کے

والد کا انتقال ہو گیا ۔ چنانچہ آن کی نگہداشت اُن کی والدہ بی بی زلیخا نے اپنے ذمے لے لی ۔ بی بی زلیخا ایک نیک ، پرہیزگار اور پاک دامن خاتون تھیں ۔ روحانیت سے محبت شیخ نے اپنی والدہ سے ورثے میں پائی ۔ کچھ عرصے کے بعد ماں بیٹا بدایوں سے دہلی آ گئے اور ایک مسجد کے نیچے معمولی سے مکان میں رہایش اختیار کر لی ۔ آن کے لیے یہ زمانہ بڑے افلاس اور مصائب کا زمانہ تھا ۔ تاہم نظام الدین نے اپنی ابتدائی تعلیم کی طرف سے غفلت نہ برتی اور اپنے دور کے عظیم دانش ور شمس الدین خوارزمی کے شاگرد ہوگئے ۔ یہ شمس الدین خوارزمی وہی ہیں جنھیں آن کے علم و فضل کی بنا پر سلطان بلبن نے اپنا وزیر مقرر کیا تھا ۔ بارہ برس کی عمر تک پہنچنے سے قبل ہی نظام الدین نے علوم ظاہری و باطنی میں خاصی استعداد بہم پہنچا لی ۔ شیخ فریدؒ کے بھائی شیخ نجیب الدین المتوکلؒ اُس زمانے میں نظام الدینؒ کے ہمسائے تھے اور نظام الدینؒ وقتاً فوقتاً آن کے ہاں جایا کرتے تھے ۔ ایک بار المتوکل کے مکان پر ملتان سے ابوبکر نامی ایک قوال آیا ۔ اس نے راہ میں اجودھن میں

واقع شیخ فرید کی درگاہ پر بھی حاضری دی تھی ۔ اس قوال نے بڑے ذوق و شوق سے درگاہ کے حالات سنائے ، نوجوان صوفی نظام الدین نے بڑی توجہ سے قوال کی باتیں سنیں اور شیخ فرید کے تقدس اور بزرگی سے اتنا متاثر ہوئے کہ فوراً اجودھن جا کر اُن کا مرید بننے کا فیصلہ کر لیا ۔

نظام الدین کئی برس تک خواجہ فرید کے ساتھ رہے اور کمال جوشِ عقیدت سے مرشد کی خدمت کرکے اُن کی خاص نظرِ عنایت حاصل کی ۔ چنانچہ جب ان کی تربیت مکمل ہوئی تو مرشد نے انھیں ایک جبہ اور قالین عطا کیا اور دعائیں دے کر دہلی روانہ کر دیا ۔ دہلی ہندوستان کا دارالحکومت ہونے کے باعث ہر طبقے اور ہر قسم کے لوگوں کی آماجگاہ بنا ہؤا تھا ۔ یہ شہر ان گناہوں اور جرایم سے آزاد نہیں تھا جو بڑے شہروں میں فصل کی طرح پھوٹ پڑتے ہیں ۔ نظام الدین کافی عرصے تک اس شہر میں قیام پذیر ہونے سے تامل کرتے رہے ۔ بالآخر انھوں نے قیام کا فیصلہ کر ہی لیا ۔ انھوں نے سوچا کہ شہروں کی چہل پہل اور سرگرمیوں سے الگ تھلگ رہ کر

اور گناہوں کی ترغیب و تحریص سے بچ کر راہبانہ زندگی بسر کرنا بڑا عظیم کام ہے لیکن لوگوں کی فلاح و بہبود کے لیے ان کے درمیان رہنا، گناہوں اور بدعنوانیوں کی فضا میں بھی پاکیزہ اور بے داغ زندگی بسر کرنا اور اپنی پاکیزگی کے طفیل غلط کار روحوں کو حق اور نیکی کی طرف لانے کی سعی کرنا اس سے بھی زیادہ عظیم کام ہے۔ چنانچہ انھوں نے شہر سے چند میل دور ایک گاؤں غیاث پور میں توطن اختیار کیا۔ اسی اثنا میں آن کے مرشد خواجہ فریدؒ واصل بحق ہونے سے قبل بیٹوں کی موجودگی کے باوجود انھیں اپنا جانشین بنا چکے تھے۔

مرشد و رہنما کی حیثیت سے حضرت نظام الدین کی زندگی کے ابتدائی برس بڑے افلاس میں گزرے لیکن جلد ہی آن کی شہرت دور و نزدیک پھیل گئی۔ علاء الدین کے عہد میں آن کے مریدوں کی تعداد ہزاروں تک پہنچ گئی۔ آن کی خانقاہ ہر وقت درویشوں سے بھری رہتی تھی کہ انھیں وہاں خوراک اور قیام کی سہولتیں ملتی تھیں۔ برنی اس دور کے بارے میں لکھتے ہیں :

شیخ الاسلام نظام الدین نے عالمی حلقۂ ارادت

کا دروازہ کھول دیا تھا ۔ وہ گناہگاروں کو اپنی نگرانی میں لے کر راہِ راست پر گام زن کیا کرتے تھے اور اُن کی خامیوں سے چشم پوشی کر کے اُنھیں جبے عنایت کیا کرتے تھے ۔ ان میں منفرد بھی ہوتے تھے اور عام بھی ؛ امیر بھی ہوتے تھے اور غریب بھی ، سردار بھی ہوتے تھے اور نادار بھی ، عالم بھی ہوتے تھے اور ناخواندہ بھی ، نرم مزاج بھی ہوتے تھے اور اکھڑ بھی ، شہری بھی ہوتے تھے اور کسان بھی ، فوجی بھی ہوتے تھے اور آزاد و غلام بھی ۔ شیخ ہر آدمی کو دعائیں دے کر چوگوشیہ ٹوپی اور مسواک عطا کرتے تھے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ تمام لوگ شیخ پر اعتماد کر کے پارسائی اور مذہب سے عقیدت پختہ کرنے کے لیے اُن کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کرتے تھے ۔ مردوں اور عورتوں ، جوانوں اور بوڑھوں ، اعلیٰ اور ادنیٰ ، ملازموں اور غلاموں ، حتیٰ کہ چھوٹے چھوٹے بچوں نے بھی نماز باقاعدگی سے پڑھنی شروع کر دی ۔ امیر اور مخیر لوگوں نے شہر اور غیاث پور کے راستے میں جگہ جگہ متعدد دل خوش کن سایہ دار چبوترے تعمیر کرائے

جہاں بڑے بڑے برتنوں میں پانی ہوتا تھا ، وضو کے لیے مٹی کے لوٹے ہوتے تھے اور نماز کے لیے چٹائیاں بچھی ہوتی تھیں ۔ ان چبوتروں پر چھپر کا سایہ ہوتا تھا اور ان کی حفاظت کے لیے محافظ اور نماز پڑھانے کے لیے پیش امام متعین تھے تاکہ شیخ کی خانقاہ کو جانے والے اور آنے والے لوگوں کو نماز کے وقت وضو ، غسل اور نماز پڑھنے میں کسی دقت کا سامنا نہ کرنا پڑے ۔ ان چبوتروں پر نماز کے وقت بے شمار لوگ نماز پڑھتے نظر آتے تھے ۔ عوام میں نہ صرف ارتکاب جرائم کم ہو گیا تھا بلکہ جرائم کے بارے میں گفت و شنید بھی ختم ہو گئی تھی ۔ اب لوگ زیادہ تر مذہبی امور پر گفتگو کیا کرتے تھے ۔ پارسائی و عقیدت کا جذبہ اتنا بڑھ گیا تھا کہ شاہی محل میں بھی بے شمار آمراء ، سلاح دار ، محرر ، سپاہی اور غلام ، جو شیخ کے مرید بن چکے تھے ، چاشت اور اشراق کی نماز ادا کرتے تھے اور فرض روزوں کے ساتھ عاشورۂ محرم اور دیگر ایام کے نافلہ روزے رکھتے تھے ۔ شہر میں کوئی جگہ ایسی نہیں تھی جہاں بیس دن یا ایک ماہ بعد سماع کی محفل منعقد

نہیں ہوتی تھی اور سامعین وجد میں آ کر
جزع و فزع نہیں کرتے تھے ۔ سلطان علاء الدین
اور اس کے تمام خاندان کو شیخ پر بڑا اعتماد
تھا ۔ ہر طبقے کے لوگوں کے قلوب نیکی و پاکیزگی
کی طرف راغب تھے ۔ خصوصاً سلطان علاء الدین
کے عہد کے آخری زمانے میں تو عوام کے لب
شراب ، عورتوں کے ذکر ، جرم و گناہ ،
قمار بازی اور دیگر گھٹیا حرکتوں کی گفتگو سے
بھی کبھی آلودہ اور نجس نہیں ہوتے تھے ۔ اکثر
طالب علم ، اُمراء اور بڑے آدمی ، جنھیں شیخ کی
محبت کی سعادت نصیب ہوتی تھی ، تصوف اور
اسلامی قوانین کی کتب کے مطالعے میں مصروف
نظر آتے تھے ۔ احیاء العلوم ، اس کا ترجمہ ،
عوارف المعارف ، کشف المحجوب ، قوت القلوب ،
التعرف کی شرح ، القشیری کا رسالہ ، مرصاد العباد ،
مکتوبات عین القضاۃ ، قاضی حمید الدین ناگوری
کی لوائح اور لوامی اور میر حسن کی فوائد الفواد
ایسی کتابیں بڑے ذوق شوق سے خریدی جاتی
تھیں ۔ لوگ کتب فروشوں سے الٰہیات اور
تصوف کی کتابوں کے بارے میں استفسار کرتے
رہتے تھے ۔ کوئی بھی ایسی دستار دکھائی نہیں

دیتی تھی جس میں مسواک یا کنگھی اڑسی ہوئی نہ ہو ۔ لاتعداد صوفی خریداروں کے باعث چمڑے کے قرابوں اور برتنوں کی قلت ہو گئی تھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

نظام الدین اولیاءؒ علم و تقویٰ میں عدیم المثال تھے ۔ انھوں نے تمام عمر شادی نہ کی اور خواجہ قطبؒ کے اس خرقے کی توہین نہ ہونے دی جو خواجہ فریدؒ کی وفات کے بعد اُن کے کندھوں پر پڑا ہوا تھا ۔ نظام الدین اولیاءؒ ایک خشک زاہد مرتاض ہی نہیں تھے ، اُن کے دن روزہ ، نماز اور مریدوں کی تعلیم میں اور راتیں شب بیداری و ریاضت میں گزرتی تھیں ۔ وہ صرف چند لمحوں کے لیے سوتے تھے ۔ صبح ملاقات کے موقع پر مرید یہ دیکھتے تھے کہ اُن کے مرشد کے چہرے پر ایک عجیب وجد آفرین تمتاہٹ اور آنکھوں میں ہلکی سرخی کی آمیزش ہے ۔ مرشد کا چہرہ دیکھ کر ہی ایک مرتبہ خسرو نے اُن سے کہا تھا :

'آپ تھکے تھکے اور بے خواب نظر آتے ہیں ۔ رات آپ نے کس کی آغوش میں گزاری کہ آپ کی آنکھوں میں ابھی تک مدہوشی اور نیم خوابیدگی

کے آثار باقی ہیں ؟"

ان تمام اوصاف کے ساتھ خواجہ نظام الدین اولیاء بڑے خوش طبع تھے - ہر طبقے کے عوام سے ملنا اور اُن سے گفتگو کرنا انہیں بہت مرغوب تھا ۔ شاعری کے متعلق بھی اُن کا ذوق بڑا بلند تھا اور سماع کے بڑے دل دادہ تھے - ہر سال ۵ محرم کو اُن کی خانقاہ میں خواجہ فریدؒ کا عرس منایا جاتا تھا ۔ لوگ دور و نزدیک سے ماہرِ فن قوالوں کی قوالی سننے کے لیے آتے تھے اور حاضرین میں روح پھونک دیتے تھے ۔"

("امیر خسرو کی تخلیقات و زندگی" مصنفہ ڈاکٹر محمد وحید مرزا ، پنجاب یونیورسٹی پریس ، لاہور ۱۹۶۲ء ، صفحات ۱۱۲ تا ۱۱۶)

نظامی مسجد کے قریب ہی شیخ فرید کے پوتے شیخ علاء الدین کا مزار ہے ۔ یہ مزار شیخ فرید کے مزار سے بڑا اور زیادہ مناسب ترتیب سے تعمیر کیا گیا ہے ۔ اس میں خاندان کے کئی اور افراد کی قبریں بھی ہیں - یہ عالی شان مزار سلطانِ دہلی محمد تغلق نے تعمیر کرایا تھا جو شیخ علاء الدین کا بڑا معتقد تھا ۔ مرکزی مسجد شیخ فرید کے مزار کی شمال مغربی سمت میں بلند زمین پر واقع ہے ۔ جنوب کی طرف حجروں کی قطار ہے ۔ ان میں سے سب سے زیادہ مقدس

حجرہ وہ ہے جس میں کلیر شریف کے مخدوم علی احمد صابرؒ رہا کرتے تھے ۔ مخدوم صابر شیخ فرید کے بھانجے ، داماد اور ممتاز خلیفہ تھے ۔ خانقاہ میں پیلو کا ایک قدیم درخت بھی ہے جو ان دنوں کی یاد دلاتا ہے جب اس علاقے میں جنگل ہی جنگل تھا اور اس قسم کے درخت خانقاہ کے مکینوں کو سایہ اور خوراک مہیا کرتے تھے ۔ مزار کے مشرق میں ایک خوبصورت سے صحن کو عبور کرنے کے بعد خزانہ آتا ہے جہاں شیخ سے منسوب مقدس تبرکات محفوظ ہیں ۔ ان میں چمڑے کے سلیپروں کا ایک جوڑا بھی ہے جو شیخ پہنا کرتے تھے ۔ خانقاہ خاصے بڑے رقبے میں پھیلی ہوئی ہے اور اس کا گوشہ گوشہ اپنے دامن میں زایر کے لیے جنت نگاہ کا سامان رکھتا ہے ۔ درگاہ کے مرکزی دروازے کے باہر بازار ہے جس میں سرمے کی چھوٹی چھوٹی شیشیاں ، گلاب کے پھول ، تصوف کی کتابیں ، جائے نماز اور مقامی دست کاروں کی بنی ہوئی اشیاء فروخت ہوتی ہیں ۔ زایرین انھیں درگاہ میں حاضری کی یادگار کے طور پر خرید کر ساتھ لے جاتے ہیں ۔ درگاہ پر دن رات زایرین کا تانتا بندھا رہتا ہے جس کے باعث درگاہ میں ہمہ وقت ذوق و شوق اور جوش و خروش کی فضا چھائی رہتی ہے ۔ پاکپتن شہر میں شیخ فرید کے نام پر ایک جدید کالج بھی قایم ہے ۔ شہر کے باشندوں نے شیخ کی قایم کردہ مہمان نوازی کی روایت ابھی تک برقرار رکھی

ہوئی ہے - یہ روایت گرد و نواح میں پھیلے ہوئے ہنستے مسکراتے کھیتوں سے بھی ٹپکتی ہے - پس یہ علاقہ جسے شیخ فرید نے منتخب کیا تھا ابھی تک بارآوری اور زرخیزی کا ثبوت دے رہا ہے اور شیخ کی اس خوبصورت مملکت میں خدائی امن و سکون کا دور دورہ ہے -

اس خانقاہ کی موجودگی میں اُن لوگوں کے باعث ، جو بڑے خلوص اور مستقل مزاجی سے بابا فرید کی پیروی کرنے کی سعی کرتے ہیں ، تصوف کی زندہ روایت آج بھی سربلند و سرفراز ہے - یہ درگاہ بہترین آثارِ قدیمہ میں سے ہے اور اسلام کے مقدس فن کی عکاس ہونے کے ساتھ صوفیانہ عقاید کے تحفظ میں بھی ممد و معاون ہے - ان دونوں پہلوؤں پر ڈاکٹر مارٹن لنگز نے بھی روشنی ڈالی ہے اور اپنے مقالے کے حق میں دلایل دیتے ہوئے کئی دوسروں کے علاوہ تقابلی مذہب کے جدید ترین متخصص ایم فردجوف سکوئن کی مدد بھی حاصل کی ہے - ڈاکٹر مارٹن لنگز لکھتے ہیں :

> ”حسن بصری کا یہ کہنا تصوف میں ایک خصوصی امتیاز رکھتا ہے : 'وہ جو خدا کو جانتا ہے اُس سے محبت کرتا ہے اور جو دنیا کو جانتا ہے اُس سے اجتناب کرتا ہے -' ایک اور قدیم صوفی کا یہ کہنا بھی بڑا معنی خیز ہے کہ 'خدا کی انس اُس کی آرزو سے زیادہ عمدہ اور

شیریں ہے ۔'

تاہم معرفت کی اس راہ کا ایک رخ اس اشاراتی نور کی عکاسی کرتا ہے جو قرآنِ پاک سے چھلکتا ہے اور قرآن کے قاری اس پُر مسرت اور خیرہ کن نور کے باعث دوسری دنیا کے اسرار و رموز کا 'مزہ' چکھتے ہیں ۔ دوسرا رخ نہ صرف قرآنی اصولوں کی کڑی سادگی کی بلکہ کچھ احادیث رسولؐ کی بھی عکاسی کرتا ہے جو ان کے بارے میں صریحاً 'خشک' لذت اور مہک رکھتی ہیں ۔ ایک متین واقعیت پسندی ہے جو ہر شے کو اس کے موزوں مقام پر رکھتی ہے مثلاً :
'اس دنیا میں ایک اجنبی یا ایک راہ گیر کی طرح رہو' یا 'مجھے اس دنیا سے کیا لینا ہے ۔ میری اور اس دنیا کی مثال ایک سوار اور درخت کی سی ہے ۔ سوار چند لمحے درخت کے نیچے قیام کرتا ہے اور پھر درخت کو پیچھے چھوڑ کر اپنی راہ چل دیتا ہے ۔'

اسلامی روحانیت کے یہ دو رخ تمام اسلامی متمدن اقوام میں بڑے متنوع طریقوں سے محسوس کیے جاتے ہیں اور بالخصوص اسلامی فن سے ظاہر ہوتے ہیں کیونکہ حسبِ توقع یہ مقدس فن

اسرار و رموز کا اظہار ہے اور اسی لیے اس کا
سرچشمہ مذہب کی نہایت گہری تہہ سے پھوٹتا ہے۔

اسلامی فن بہت پیچیدہ و دقیق ہے لیکن اس
کے ساتھ ہی شاعرانہ اور دل فریب بھی ہے!
اس کے تانے بانے میں متانت اور شان و شوکت
ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس میں نمو کی مسرت خیز فراوانی
اور بلور کی خالص قوت کا جوہر متحد ہیں ۔ یہ
محرابِ عبادت ہے جسے طغرائی گل کاری سے آراستہ
کیا گیا ہے اور اس گل کاری پر کبھی تو چمن
کا اور کبھی برف کے گالے کا گمان ہوتا ہے ۔
خوبیوں کی یہ آمیزش قرآن میں بھی ملتی ہے ،
جہاں خیالات کی وسعت تناسب و ترتیب کے
شعلے میں پوشیدہ ہے ۔ اگر کوئی اسے پا لے تو
وحدت کے نظارے سے مسحور ہو جائے ۔ اسلام
میں صحرا کی سادگی ، سفیدی اور درشتی کا بھی
پہلو ہے اور یہی اس کے فن میں آرایش و تزئین
کی بلوریں مسرت کے ساتھ ساتھ پایا جاتا ہے ۔''
(''بیسویں صدی کا ایک مسلم درویش'' مصنفہ
مارٹن لنگز ، لندن ۱۹۶۱ء ، صفحات ۴۶-۴۷)

اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں کہ پاکپتن شریف
رہنے والا ہر قسم اور ہر نوع کا آدمی پاکپتن کے تعلق

فخر کرتا ہے ۔ تمام مؤرخ شیخ کی عظمت و شان کو تسلیم کرتے ہیں اور ان الفاظ میں مل کر صدائے تحسین و آفریں بلند کرتے ہیں : ''کوئی ولی عقیدت و خلوص اور توبہ و استغفار میں گنج شکرؒ پر سبقت نہیں لے جا سکا ۔'' پروفیسر ایم ۔ کبیر اپنی کتاب ''پاکستان کی مختصر تاریخ'' جلد دوم میں لکھتے ہیں :

''اور یہ شیخ فرید الدینؒ پاکپتن شریف والے کی خصوصی مساعی کا نتیجہ ہے کہ سلسلۂ چشتیہ کی شاخیں برِ صغیر پاک و ہند کے تمام بڑے بڑے اور اہم شہروں میں قایم ہوگئیں ۔ شیخ فریدؒ کو سب سے بہتر اور قیمتی ہدیۂ عقیدت مولانا غلام قادر گرامی نے پیش کیا ہے جنھیں حکیم الامت علامہ اقبالؒ بھی فارسی شاعری میں اپنا آستاد اور رہنما سمجھتے تھے :

در شہر گرامی ست کہ معنی نظر ست
در پنجۂ مرگ سخت بے بال و پر ست
در تلخیِ نزع حکم آمد بہ اجل
بگزار کہ ایں مریدِ گنج شکرؒ ست

آخر میں ہم اس رسالے کو ایک بہترین مادۂ تاریخ پر ختم کرتے ہیں جو مفتی غلام سرور نے نکالا ہے اور مولوی نور احمد چشتی کی کتاب ''تحقیقاتِ چشتی'' میں بھی موجود

ہے - یہ تاریخ کے خراجِ عقیدت کا ملخص ہے :

خواجۂ ذی شان فرید الدین ، فریدِ دو جہاں
آں کہ از دل طالبش شد ، گشت مطلوبِ خدا
بود ذاتش مخزنِ حبِ خدا گنجِ شکر
عقل سالِ نقلِ او فرمود : محبوبِ خدا

۶۶۳ ہجری

ء

کتابیات

اخبار الاخیار مصنفہ شیخ عبد الحق محدث دہلوی ۔

فوایدالفواد مصنفہ میر حسن اعلیٰ سجزی (خواجہ حسن دہلوی) مرتبہ محمد لطیف ملک ، مطبوعہ ملک سراج دین ، کشمیری بازار ، لاہور ۱۹۶۶ء ۔

سوانح حضرت بابا فریدالدین گنج شکرؒ مصنفہ وحید احمد مسعود ، پاک اکیڈمی ، کراچی ۱۹۶۱ء ۔

تبلیغِ اسلام مصنفہ سر ٹامس آرنلڈ ، لندن ۱۸۹۶ء ۔

آباءِ صحرا مصنفہ ہیلن ویڈل ، کولنز ۱۹۶۲ء ۔

بیسویں صدی کا ایک مسلم درویش مصنفہ مارٹن لنگز ، لندن ۱۹۶۱ء ۔

، ایک صوفی شہید مصنفہ اے ۔ جے ۔ آربری ، لندن ۱۹۶۹ء ۔

ازمنۂ وسطیٰ کے ہند کی تاریخ کا مطالعہ مصنفہ کے ۔ اے ۔ نظامی ، علی گڑھ ۱۹۵۶ء ۔

بابا فرید کے دوہے مرتبہ مقبول الٰہی ، مجلس شاہ حسین ، لاہور ۱۹۶۷ء -

اسلام کے تصورات و حقایق مصنفہ سید حسین نصر لندن ۱۹۶۶ء -

ازمنۂ وسطیٰ کا اسلام مصنفہ گستاف ای - وان گرون بام ، شکاگو یونیورسٹی پریس ۱۹۶۲ء -

شیخ فریدالدین گنج شکرؒ کی زندگی اور دور مصنفہ کے - اے - نظامی ، علی گڑھ ۱۹۵۵ء -

اسلام کے صوفی مصنفہ آر - اے - نکلسن ، لندن ۱۹۱۴ء

صوفی ازم مصنفہ اے - جے - آربری ، لندن ۱۹۵۰ء -

کشف المحجوب مصنفہ شیخ علی الہجویری ، مترجم آر - اے - نکلسن ، ای - جے - ڈبلیو - گب میموریل سیریز ، لندن ۱۹۵۹ء -

خطۂ پاک اوچ مصنفہ مسعود حسن شہاب ، اردو اکیڈیمی ، بہاول پور ۱۹۶۷ء -

تذکرۂ صوفیاء پنجاب مصنفہ اعجاز الحق قدوسی ، سلیمان اکیڈیمی ، کراچی ۱۹۶۲ء -

تذکرۂ صوفیاء بنگال مصنفہ اعجاز الحق قدوسی ، مرکزی اردو بورڈ ، لاہور ۱۹۶۵ء -

پنجابی صوفی شعراء مصنفہ لاجونتی راما کرشنا ، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس ۱۹۳۸ء -

سکھ مت جلد پنجم مصنفہ میکس آرتھر میکلیف ، ایس - چاند اینڈ کمپنی ، دہلی ۱۹۶۳ء -

پنجابی شاعری میں مکرر الوقوع نمونے مصنفہ نجم حسین سید ، مجلس شاہ حسین ، نقی روڈ ، لاہور ۱۹۶۸ء -

تحقیقاتِ چشتی مصنفہ مولوی نور احمد چشتی ، پنجابی اکیڈیمی ، لاہور ۱۹۶۴ء -

صوفیانہ عقیدے کا تعارف مصنفہ ٹی - برک بارٹ ، شیخ محمد اشرف ، لاہور ۱۹۶۸ء -

ہند کے ماحول میں اسلامی ثقافت کا مطالعہ مصنفہ عزیز احمد ، آکسفورڈ ۱۹۶۴ء -

قدامت کے پہلو مصنفہ ایم - آئی - فنلے ، لندن ۱۹۶۸ء -

تذکرۂ فریدیہ مصنفہ مولانا محمد مشتاق احمد چشتی ، لاہور ۱۹۶۶ء -

منٹگمری ڈسٹرکٹ گیزیٹیر ، جلد اے ۱۹۳۳ء -

بابا فریدؒ مصنفہ سید ناصر احمد جامعی، لاہور ۱۹۶۲ء -

پاکستان کی مختصر تاریخ جلد دوم مصنفہ ایم - کبیر ، کراچی یونیورسٹی ۱۹۶۷ء -

انوار الفرید مصنفہ سید مسلم نظامی ، پاکپتن شریف ۱۹۶۵ء ۔

امیر خسرو کی زندگی اور تخلیقات مصنفہ ڈاکٹر محمد وحید مرزا ، پنجاب یونیورسٹی پریس ، لاہور ۱۹۶۲ء ۔

پنجابی لٹریچر مصنفہ آئی ۔ سیریبرایاکوف ، نوکا پبلشنگ ہاؤس ، سنٹرل ڈیپارٹمنٹ برائے مشرقی ادب ، ماسکو ۱۹۶۸ء ۔

پاکپتن اور بابا فرید گنج شکرؒ مصنفہ ڈاکٹر ایم ۔ عبداللہ چغتائی ، کتاب خانہ نورس ، کبیر سٹریٹ ، لاہور ۱۹۶۸ء ۔

فلسطین کے مسلمان اولیاء اور عبادت گاہیں مصنفہ توفیق کنعان ، لوزاک لمیٹڈ کمپنی ، لندن ۱۹۲۷ء ۔

شارٹر انسائیکلوپیڈیا آف اسلام ، ای ۔ جے ۔ برل ، لیڈن ۱۹۷۱ء

اسلام میں سائنس اور تمدن مصنفہ سید حسین نصر ، ہارورڈ یونیورسٹی پریس ، کیمرج ، میسا چوسٹس ۱۹۶۸ء ۔

۱

بابا فریدالدین مسعود

گنجِ شکر رحمۃ اللہ علیہ

جعفر قاسمی

ترجمہ

طاہر اسدی

اسلامک بُک فاؤنڈیشن

۲۴۹- این- سمن آباد- لاہور

واحد تقسیم کار: "المعارف"، گنج بخش روڈ، لاہور